بسم الله الرحمن الرحیم

شعور اتحاد

سال اول ۞ شمارہ (۳) ۞ ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ ۞ اپریل، مئی، جون ۲۰۰۸ء

پیشکش: مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی

نگران اعلیٰ: آیۃ اللہ محمد علی تسخیری

مدیر مسؤل: علی اصغر اوحدی

علمی گروہ کی زیر نگرانی

چیف ایڈیٹر: سید احتشام عباس زیدی

سہ ماہی ''شعور اتحاد'' مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو مستحکم بنانے نیز عالم اسلام کو فقہی، حقوقی، کلامی، فلسفی، تاریخی و... میدانوں میں درپیش مشکلات اور دشواریوں کے حل کے لئے نئی راہیں کھولتا ہے۔

یہ مجلّہ مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے متعلق لکھے جانے والے علمی مقالوں کا استقبال کرتا ہے۔

یہ مجلّہ مقالات کی ایڈیٹنگ اور تلخیص میں آزاد ہوگا۔

مجلّہ کے مطالب نقل کئے جا سکتے ہیں لیکن حوالہ ضروری ہے۔

....

ایڈریس: تہران، خیابان آیۃ اللہ طالقانی، شمارہ ۳۵۷ ''مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی''

معاونت فرہنگی و پژوہشی

ٹیلی فون: ۱۳-۸۸۳۲۱۴۱۱-۸۸۸۲۲۵۳۲-ای میل andisheh@taqhrib.org

فہرست

حماس کی درخشاں کامیابی 5

فکر و شعور

عالم اسلام کے مشکلات اور جہانی سازی کی روشنی میں ان کا علاج ۱۱

اتحاد کے اچھے اور تفرقہ کے برے آثار ۲۷

مردہ یا دماغی موت میں مبتلا انسان کے عضو کو ہدیہ کئے جانے کے قانونی آثار ۴۵

اسلام کے فقہی مذاہب، مشکلات فقر کے مقابل ۷۳

حضرت فاطمہؑ امّہات مؤمنین کی نظر میں ۹۳

آج کی دنیا میں مسلمانوں کی حالت ۱۰۳

اکیسویں بین الاقوامی وحدت کانفرنس کا اختتامی بیانیہ ۱۲۳

منشور اتحاد اسلامی کا مسودہ ۱۲۷

اتحاد کے علمبردار

پیکر اخلاص حضرت آیت اللہ العظمٰی بروجردی ۱۳۵

پیکر شجاعت شیخ محمود شلتوت ۱۵۹

عالم اسلام کا تعارف

ترکی جمہوریہ کی جغرافیائی حدود ۱۸۷

حماس کی درخشاں کامیابی

تقریبا ایک سال کے مکمل محاصرہ اور مسلسل جنگ کے بعد آخر اسرائیلی صہیونیوں کو غزہ پٹی کا محاصرہ اٹھانے اور پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا اور دنیا کی نگاہوں میں حماس کو ایک بڑی کامیابی نصیب ہوئی اگرچہ بظاہر مصر نے درمیان میں آکر یہ مفاہمت کرائی جو تصویر کا ظاہری رخ ہے لیکن تاریخی تجربات سے یہ پوری طرح واضح ہے کہ اسرائیلیوں کی پسپائی کبھی کسی ترحم کی بنیاد پر نہیں ہوتی جب تک وہ خود منھ کی نہیں کھاتے یا انھیں انتہائی نقصان نہیں پہنچتا وہ پیچھے نہیں ہٹتے۔

آخر کیا ہوا کہ جن فلسطینیوں کو انھوں نے ایک سال سے اس طرح محاصرہ میں لے رکھا تھا کہ دنیا سے ان کا رابطہ تقریبا کاٹ دیا تھا لاکھوں فلسطینی تقریبا تین سو مربع کلومیٹر کے علاقے میں قید ہو کر رہ گئے تھے اسرائیلیوں نے پانی کی سپلائی بند کردی تھی بجلی کٹ گئی تھی اسپتالوں میں دوائیں ختم ہوگئی تھیں کھانے پینے کی اشیاء اور ضروری وسائل کی شدید کمی واقع ہوگئی تھی اس لئے کہ ایک سال سے ان فلسطینیوں کا باہر سے رابطہ کٹ چکا تھا اس پر اسرائیلیوں کی طرف سے روز آنہ ہونے والے زمینی اور ہوائی حملے ہر روز متعدد افراد کا شہید اور زخمی ہونا مکانات کا بموں کے ذریعہ مسمار ہونا آبادیوں کا تہس نہس کیا جانا کھیتوں اور باغات کا تباہ و برباد کیا جانا اور حماس کے سرکردہ او رذمہ دار افراد کا منصوبہ بند طریقہ سے قتل یا اغوا آئے دن کا مشغلہ ہوگیا تھا ۔اس کے باوجود اسلامی مقاومت حماس اوراس کے حامی فلسطینیوں نے ہمت نہیں ہاری اور صہیونی درندوں کے مقابل ڈٹے رہے۔

پتھروں سے میزائیلوں تک

بیس سال پہلے فلسطینیوں نے جس انتفاضہ کا آغاز پتھروں سے کیا تھا اس کا سلسلہ اب میزائیلوں تک پہنچ چکا ہے، اس دوران سرائیلی درندے ان پر جتنے مظالم توڑ سکتے تھے انھوں نے توڑے لیکن فلسطینی قوم نے اپنی قوت بازو اور خدا کے امداد غیبی پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے جہادی سفر کو جاری رکھا، یہاں تک کہ حماس کے وجود میں آنے کے بعد اسرائیلیوں کے خلاف جہاد میں حیرت انگیز تبدیلی آئی اگر چہ عوام کی جانب سے منتخب کئے جانے کے بعد حماس کی حکومت کو اندر اور باہر سے توڑنے کی بہت کوششیں کی گئیں فلسطینیوں کے درمیان خانہ جنگی کا بازار گرم کیا گیا لیکن حماس کے مجاہدین نے اپنے خون میں نہا کر اس جہاد کی رفتار تیز سے تیز تر کی۔ نتیجہ میں اس مظلوم گروہ نے پوری مظلوم قوم کے دل میں گھر کر لیا ۔ پچھلے سال سے غزہ کے علاقے میں حماس کو قید کر کے نابود کرنے کا منصوبہ امریکہ اور اسرائیل کا باہمی منصوبہ تھا لیکن حماس نے اپنے مجاہدانہ عمل سے قرآن کی اس آیت کو عملی طور سے ثابت کر کے دکھا دیا۔

> ﴿یا ایھا النّبی حرض المومنین علی القتال ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین و ان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفاً من الذین کفروا بانّھم قوم لایفقھون﴾ (انفال/۶۵)
>
> ’’اے نبی آپ مومنوں کو قتال پر آمادہ کیجئے (اوران سے کہئے) اگر تم میں سے بیس صابر افراد ہوں گے تو وہ دوسو لوگوں پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سے سو افراد ہوں گے تو وہ ہزار کفار پر غالب آجائیں گے کیوں کہ کفار عقل نہیں رکھتے ،،

نتیجہ یہ ہوا کہ جس جہادی سفر کا آغاز فلسطینی جیالوں نے پتھروں اور ڈھیلوں سے کیا تھا آج وہ میزائلوں تک پہنچ گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ فلسطینیوں کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے مزائیلوں نے غزہ سے ملے ہوئے کئی اسرائیلی شہروں کو نشانہ بنا کر صہیونیوں کی نیندیں حرام کر دیں اور انھیں ان شہروں کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ آج اسقلان اور دوسرے اسرائیلی شہر جو غزہ کے شمال میں ہیں ویران پڑے ہوئے ہیں۔ اور اسرائیلی عوام نے

حکومت کے خلاف جنگ روکنے کے لئے مظاہرے شروع کر دیئے۔ ابھی دو سال پہلے حزب اللہ کے جوابی مزائیلی حملوں کے دہشت سے اسرائیلی حکومت اور عوام ابھر نہیں پائے تھے کہ حماس کے مزائیلوں نے پھران کی نیندیں اڑا دیں یہی سبب ہے کہ اسرائیل نے مصر کو بیچ میں لا کر بلا کسی قید و شرط کے پیچھے ہٹنا قبول کرلیا۔ اگر چہ عالمی میڈیا نے اس کا سہرا اپنے اور اسرائیل کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے لیکن درحقیقت یہ اسرائیل کی دہشت زدگی ہے جس نے اسے اس اقدام پر مجبور کیا ہے۔

کیا حماس ٹرریسٹ ہیں

صیہونی اور عالمی میڈیا نے جس حماس کو ٹرریسٹ ظاہر کرتے ہوئے اس کے خلاف زبردست پروپیگنڈے کیئے، اسے آج کی فلسطینی دنیا میں دلوں کی دھڑکن کہا جاتا ہے۔ حماس کے مرکز اور اس کے حامیوں کے علاقہ غزہ کو ایک سال تک محاصرہ میں لے کر ان پر ظلم و ستم کے سارے پہاڑ توڑ ڈالے گئے اور سیکڑوں بہیمانہ فوجی حملے کئے گئے جن کے سبب صرف غزہ کے علاقے میں ہزاروں بے گناہ مرد اور عورتیں بوڑھے اور بچے اجل کا نشانہ بنے اور سیکڑوں فلسطینی جیالوں نے اپنے سینوں پر صیہونی گولیوں کا استقبال کیا۔ اس ناکہ بندی اور محاصرہ کے سبب اسپتالوں میں دواؤں کے نہ ہونے اور مریضوں تک طبی امداد نہ پہنچنے کے سبب گزشتہ ایک سال میں ایک سو نواسی مریض جاں بحق ہوئے ۔لیکن اتنی تنگیوں اور سختیوں کے باوجود نہ صرف حماس کے خلاف کوئی اواز اٹھی نہ مظاہرے ہوئے، بلکہ حماس کی ہر دل عزیزی میں روز بروز اضافہ ہوا اور وہ فلسطینی قوم کے دلوں کی ڈھڑکن بنتی گئی۔ آج حماس نہ فقط غزہ کے علاقہ میں محبوب اور قوی ہے بلکہ اس کی محبوبیت کا دائرہ الفتح کے علاقوں دنیا کے تمام فلسطینیوں اور عام مسلمانوں تک پہنچ چکا ہے۔ بھوک پیاس اور محاصرہ کی سختیوں میں رہ کر کوئی بھی قوم کسی ٹرریسٹ تنظیم کی حمایت نہیں کر سکتی۔ فلسطینیوں نے اپنے صبر و تحمل سے اور حماس نے اپنے عزم و حوصلے، دلیری اور شجاعت سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا مدمقابل تو ساٹھ سالہ پرانا ٹرریسٹ ہے وہ ٹرریسٹ نہیں ہیں۔

اتحاد کی طاقت

غزہ کے مٹھی بھر صابر باایمان اور متحد مسلمانوں کی اس درخشاں کامیابی نے ایک طرف پورے عالم اسلام

کے مظلوموں کو خوش کر دیا تو دوسری طرف اسلامی دنیا کے سامنے یہ حقیقت واضح کر دی کہ اگر مسلمان اسلام اور قرآن کے سایہ میں متحد ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت انھیں مغلوب نہیں کر سکتی بلکہ وہ غالب ہو کر پوری دنیا پر چھا جائیں گے اتحاد آج مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے عالمی مظالم سے نجات پانے کے لئے اور کائنات میں امن وصلح اور عدل وانصاف کا پرچم لہرانے کے لئے۔

اسلامی جمہوریہ ایران عالم اسلام میں اتحاد کی فضا قائم کرنے والا وہ واحد ملک ہے جسے اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے، لیکن اسلامی مصلحتوں کے پیش نظر وہ ابتدا سے اتحاد کا پرچم دار رہا ہے۔ آج دنیا کی مسلمان قومیں بیدار ہو رہی ہیں اور ایران کے باہر بھی یہ نعرے بلند ہونے لگے ہیں ''یا ایھا المسلمون اتحدوا اتحدوا'' اے مسلمانوں ایک ہو جاؤ متحد ہو جاؤ۔ لبنان کی ۳۳ روزہ جنگ اور حماس کی اس درخشاں کامیابی نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اسرائیل کوئی ہوّا نہیں ہے بلکہ اس نام نہاد ہیولہ کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں صاف سنائی دینے لگی ہیں ۔اور وہ دن دور نہیں جب قبلہ اول کی سرزمین ہمیشہ کے لئے صہیونی درندوں سے پاک ہو جائے، اور اس سرزمین کے اصلی باشندے مسلمان ہوں یا عیسائی یا یہودی، اپنی تقدیر کا فیصلہ ریفرینڈم کے ذریعے خود کریں اور سب مل جل کر باہم مسالمت آمیز زندگی بسر کریں۔

فکر و شعور

عالم اسلام کے مشکلات اور
جہانی سازی کی روشنی میں ان کا علاج

آیت اللہ محمد علی تسخیری
ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

خلاصہ:

جہانی سازی (Globalization) ایک عالمی تحریک ہے، آج یا کل سب کو اس کا سامنا کرنا ہے۔ یہ سلسلہ سب کو اپنے موقف میں نظر ثانی کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ عالم اسلام بھی اس دنیا کا ایک عظیم پیکر ہونے کی وجہ سے، امریکہ کے بنائے ہوئے اس عالمی منصوبہ کے خطرناک نتائج اور نقصانات کی زد میں ہے۔
اس تحریر میں پہلے جہانی سازی کی تعریف پیش کی گئی ہے، خاص کر وہ تعریف جو مغربی طاقتوں خصوصا امریکہ نے پیش کی ہے، جس میں غربی سیویلائزیشن کے علاوہ ہر تہذیب وتمدن کو ختم کرنے اور ساری دنیا پر امریکی طرز کی تہذیب کو تھوپنے پر زور دیا گیا ہے۔
اس وضاحت کے بعد ایسی جہانی سازی کے خطرناک نتائج اور نقصانات کی

طرف روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر اس جہانی سازی کی راہ کی رکاوٹوں کو بیان کیا گیا ہے جس کی وجہ سے امریکہ کو اپنے مستکبرانہ مقاصد کی تکمیل میں خاصی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس میں سے سب سے اہم عالم اسلام ہے، اور اسلام کا عالمی حکومت کا تصور، یہیں سے اس مسئلہ کو لے کر عالم اسلام کے مسائل شروع ہوتے ہیں، مقالہ نگار کی خاص تاکید انھیں مسائل اور اس کے حل کی جانب ہے لہٰذا پہلے عالم اسلام کی موجودہ حالت کی وضاحت کرتے ہیں پھر مرحلہ وار ان مسائل کے حل کے لئے چند حکمت عملی بیان کرتے ہیں تاکہ عالمی پیمانہ پر تمام اسلامی مملک مل کر اس بھیانک یلغار کے خطرناک نتائج اور اس کے نقصانات کی روک تھام کرسکیں۔۔۔

کلیدی الفاظ: جہانی سازی، مغربی جہانی سازی، اسلامی عالمی حکومت، اسلامی امت، عملی راہ حل۔

ساری دنیا من جملہ عالم اسلام، مغربی طاقت کی طرف سے پیش کردہ ''نئے عالمی نظام'' کے سلسلہ میں جو کہ وسیع پیمانہ پر عالمی سطح کی ایک بہت بڑی تحریک ہے، مغرب کے ساتھ روابط کے بارے میں ایک خاص حالت سے دوچار ہوئے ہیں، اس مسئلہ نے سب کو اپنے موقف میں نظر ثانی پر مجبور کر دیا ہے۔ کیوں کہ ان کی اقتصادی، اجتماعی ثقافتی سیاسی حیات، یہاں تک کہ اقوام عالم کے علاقائی آداب و رسوم بھی اس بھیانک سیلاب کی زد میں آ کر خطرہ میں پڑ گئے ہیں۔

ہم بھی یہی مانتے ہیں کہ عالم اسلام، دنیا کے کسی بھی خطہ سے زیادہ اس منصوبہ کے خطرناک نتائج کی زد میں ہے، کیوں کہ یہ وحشی جہانی سازی (وحشی کا لقب خود مغربیوں نے دیا ہے) خاص طور سے عالم اسلام کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہے، اور اس سیسٹم کے نفاذ کے لئے بنائی گئی پالیسیاں صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو نمایاں کر رہی ہیں (مثال کے طور پر ۱۹۹۷ء کی امریکن پالیسی) بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ اس یلغار کا رخ سب سے پہلے ہماری جانب ہے۔ ہمارے اوپر عسکری، ثقافتی اور اقتصادی دباؤ اور نئے قسم کی استعماری سازشوں من جملہ عالم اسلام اور اس کے اطراف پر مشتمل عظیم مشرق وسطیٰ جیسے منصوبوں سے یہ بات واضح طور سے سمجھی جاسکتی ہے۔

اور چوں کہ اسلامی تصور کائنات اور اسلامی تعلیمات مغربی تہذیب کے بہت سے اقدار اور معیارات

کے بالکل برعکس ہے، لہٰذا مغرب ایک بہت بڑی رکاوٹ سے دوچار ہے۔

اس کے علاوہ، صدیوں کی کشیدگی، جنگیں، اور عسکری فتح کے ردوبدل سے ایک طرح کی تاریخی رنجشیں اکٹھا ہوگئیں ہیں، اس طرح کہ کبھی عالم اسلام مغرب کے مرکز تک پھیل گیا اور کبھی عالم اسلام خود مغربی قبضہ اور اس کے استعمار کا شکار ہو گیا، اور کوئی خطہ اس کی زد سے نہ چھوٹا۔ ان سب کا جذباتی اثر یہ ہوا کہ ایک تاریخی کینہ پنپ گیا اور دونوں طرف کی آپسی پالیسیوں میں نیا رنگ دکھاتا گیا۔ یہاں تک کہ خود تاریخی حقائق کے علمی تجزیہ وتحلیل میں اور تاریخ کا علمی نظریہ قائم کرنے میں بھی اپنا اثر دکھا گیا، حالانکہ یہ ایک علمی معاملہ ہے، اور ایک تاریخی ضرورت ہے۔

آج عالم اسلام میں مغربی جہانی سازی سے شدید غم وغصہ کی لہر پھیلی ہوئی ہے، یہ غم وغصہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ جہانی سازی تمدن اور تہذیب کی ترقی یافتہ ایک عام حالت ہے جو کہ بشریت کو انتشار سے اتحاد اور یکجہتی کی طرف لے جارہی ہے، اگر ایسا ہوتا تو یہ بہت ہی نیک اور اچھی چیز ہوتی اور کسی کو اس کی واقعیت میں شک نہیں ہے۔ لیکن غم وغصہ کا اظہار اس لئے ہے کہ مغربی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ اس سواری کی لگام کو اپنے ہاتھوں میں لے کر صرف اپنے قابوں میں رکھیں اور اسے اپنے متکبرانہ مقاصد کی تکمیل کی جانب موڑ دیں۔ اس طرح تمام امور پر قابو پاکر اپنا اقتصادی، ثقافتی، اور عسکری تسلط، عالمی سطح پر جمادیں۔ اور یہ بہت بڑا خطرہ ہے۔ اگر ہم اپنی تہذیب وتمدن کی عظیم میراث کی حفاظت کرنا اور عالم تمدن کی تعمیر میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو اس خطرہ سے نپٹنے کے لئے ایک منظّم حکمت عملی اختیار کرنا ہوگی، اس کے لئے پہلے اجمالی طور سے جہانی سازی کے مفہوم کو سمجھنا ہوگا تاکہ اس کے خطروں سے مقابلہ کے لئے حکمت عملی اختیار کی جاسکے۔

جہانی سازی کیا ہے(Globalization)؟

جہانی سازی کی تعریف بہت پیچیدہ اور مبہم ہے اس سلسلہ میں مختلف اور طرح طرح کی تعریفیں بیان ہوئی ہیں ان تمام تعریفوں اور مختلف تفسیروں سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں جہانی سازی مغربی تہذیب کے علاوہ ہر تہذیب وتمدن کے نابود کرنے اور دنیا پر نظام سرمایہ داری تھوپنے اور تمام تہذیبوں کو امریکی سانچہ میں ڈھالنے اور ساری دنیا کو امریکہ کے قبضہ میں لانے کا دوسرا نام ہے۔

اس سلسلہ میں یہاں صرف تین نمونے مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

۱)۔ ۱۹۹۸ء میں بین الاقوامی کمیشن کی جانب سے جہانی سازی کی تعریف میں اسے ملکوں کی سرحدوں اور قومی پہچان کو ختم کر کے ان کے اقتصادی، سیاسی ثقافتی یہاں تک کہ دنیا بھر کی اقوام کے علاقائی رسم و رواج میں مداخلت جانا گیا ہے۔

۲)۔ بعض عربی مفکرین کی طرف سے جہانی سازی کی تعریف میں مغربی طاقتوں کے تسلط سے دنیا بھر میں سرمایہ داری کے غیر عادلانہ نظام کی حاکمیت بتائی گئی ہے۔

۳)۔ امریکی مبصر جیمس روزناو، جہانی سازی کی تعریف میں ان سوالوں کو پیش کرتا ہے: کیا جہانی سازی یکسانیت کے احساس کی بنیاد پر یک جہتی کی جانب ایک سفر ہے یا اونچ نیچ اور دیگر اختلافات کو مزید گہرا کرنے کا ایک ذریعہ ہے؟ آیا جہانی سازی کا سرچشمہ ایک ہے یا متعدد ہیں آیا جہانی سازی میں ایک ہی تہذیب کا فرما ہے یا بہت سی تہذیبوں کا سنگم ہے؟ آخر کار اس کا ماننا ہے کہ جہانی سازی میں یہ تین چیز ضروری ہے: سرحدوں کا ختم ہونا، غالب نظام ہونے کے ناطے مغربی نظام کا نمایاں ہونا اور دوسروں کو اپنی راہ و روش کی پیروی پر مجبور کرنا۔

اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہانی سازی حقیقت میں عالمی پیمانہ پر سیاسی روابط اور اجتماعی حقوق کا امریکی ہونا اور دوسروں پر مغربی تہذیب کو تھوپنا ہے، اور یہ مسئلہ شیطان کے وسوسوں سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

مغربی دنیا نے اپنی علمی ٹیکنالوجی، ثقافتی یلغار، اور عسکری برتری کے بل بوتے اس نظریہ کو پیش کیا ہے اور کچھ دانشوروں نے اس سلسلہ میں تھیوریاں اور پیش کر کے اس کے نفاذ اور اجرا کی زمین ہموار کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہنٹنگٹن کا نظریہ بہت مشہور ہے۔ وہ اپنے نظریہ میں مغربی تہذیب پر بہت زور دیتا ہے، اور اسے، آزادی، بشر دوستی، اور تنوع کے لحاظ سے دوسری تمام تہذیبوں پر فوقیت دیتا ہے، اور مغربی تہذیب کے علاوہ دوسروں کو، استبداد قدامت پرستی، پرانے اقدار کی پیروی انسان کے مسائل جیسے غریبی، بے روزگاری، نچلی سطح کی زندگی، جمعیت میں بے تحاشا اضافہ کے حل کے لئے ناکافی قرار دیتے ہوئے ان پر ڈکٹیٹر شپ کی تاکید کرتا ہے۔

یہ نظریہ مغربی دنیا کو صلاح دیتا ہے کہ دوسری تہذیبوں سے رواداری نہ رکھیں۔ اپنی ٹکنولوجی انھیں نہ دیں ۔مغربی ممالک آپس کے اقتصادی سیاسی اور اداری نظام میں متحد ہو جائیں۔ اس تھیوری کا ماننا ہے کہ مغربی تہذیب کی تعمیر، یونانی اور عیسائی یورپ کی میراث سکولریزم، قانون کی حکومت، اجتماعی تنوع، سوشلائیزیشن اور انسانی حقوق کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ یہ چند نمونے ہیں جن کی بنا پر مغربی تہذیب دوسری تہذیبوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ ''فوکویاما''

بھی سرمایہ داری نظام کو تاریخ کا نہائی مقصد قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تمام اقوام عالم کو سرمایہ داری کی طرف قدم بڑھانا چاہیے اس سلسلہ میں سیاسی اور اجتماعی زمینیں فراہم کرنا ہوں گی، ان سے اجتماعی ساخت کو بدلنا ہوگا، تا کہ دنیا قوم پرستی، تنگ نظری سے دور مساوات کی جانب آگے بڑھے ۔ مذہب کی بھی اس انقلاب کے مطابق تفسیر کرنا ہوگی، اس سلسلہ میں ہر معاشرے پر ضروری ہے کہ اپنے اندر اعتدال پسند افراد، تنظیموں اور حکومتوں کو ایجاد کرے۔ اسی طرح وہ صلاح دیتا ہے کہ قوموں کی برتری اور ان کے امتیازات جتانے میں غلو نہ کیا جائے کیوں کہ اس سے قوموں کا تمدن محدود اور گم ہو جاتا ہے۔ وہ تمام شدت پسندانہ افکار اور اقدام کی شدید تنقید کرتے ہوئے مذہبی تعلیمات کی تفسیر میں روشن فکرانہ روش پر زور دیتا ہے اور دانشوروں سے درخواست کرتا ہے کہ ہر طرح سے آزادی اور ڈیموکریسی کی حمایت کریں، اس طرح وہ سرمایہ دارانہ نظام کو اصل مقصد کے عنوان سے پیش کرتا ہے جس کی جانب دنیا کی تمام تہذیبوں کو جانا ہوگا۔

انگریز دانشور ''بیڑ ہام برایام'' بھی ۱۹۹۴ء میں اکونومسٹ میگزین میں چھپے سلسلے وار مضامین میں کچھ شباہتوں پر زور دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ پندرہویں صدی ہجری میں عالم اسلام کی صورت حال پندرہویں صدی عیسوی کے یورپ سے بہت ملتی جلتی ہے اس کا ماننا ہے کہ مسلمانوں کی آج کی مذہبی ساخت اور شدت پسندانہ کیفیت سے، جس طرح سے پندرہویں صدی عیسوی میں کلیسا کے استعمارانہ برتاؤ سے لوگ تنگ آچکے تھے اور دین میں اصلاحات کے مشتاق تھے، عالم اسلام میں بھی اسی طرح تنگ آکر اپنی مذہبی ساخت میں اصلاحات کے متمنی ہوں گے، اور اس طرح اصلاحات انجام دینے کا موقع فراہم ہو جائے گا اس کا ماننا ہے کہ دونوں مشابہتوں کے ساتھ اس کے عوامل بھی ملتے جلتے ہیں۔ جو اس کی کیفیت کی حمایت کر رہے ہیں اور اسے آگے بڑھا رہے ہیں کل یورپ میں انقلاب بپا کرنے اور وہاں کی نشأۃ ثانیہ میں مسلمانوں نے بیرونی دنیا کا کردار ادا کیا تھا۔ تو آج مغرب عالم اسلام کو آگے بڑھانے اور وہاں ترقیاتی انقلاب لانے میں وہی کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ یہ تحریک ان آزاد خیال اور روشن فکر مسلمانوں سے شروع ہوگی جو ڈیموکریسی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان افراد کی پوری طاقت کے ساتھ حمایت کرنی چاہیے وہ اپنے مضامین کے اختتام پر عالم اسلام کو تین مشورہ دیتا ہے۔ تا کہ مغرب کے ساتھ قدم سے قدم ملانے اور آج کے انسانی تمدن کے کاروان کے ساتھ چلنے کے قابل بن سکیں۔

۱۔ نئے اقتصادی نظام کے ساتھ ہماہنگ ہونا۔

۲۔ مرد اور عورت میں مساوات کا قائل ہونا۔

۳۔ حکومتی سیسٹم میں ڈیموکریسی اصولوں کی پیروی کرنا۔

اس طرح جہانی سازی کی تھیوری اور اقوام عالم کی طرز زندگی کو امریکی سانچہ میں ڈھالنے کا کام، مختلف شعبوں میں پھیلا ہوا ہے جیسے: کمپیوٹر، انٹرنٹ، سٹ لائیٹ اور بین الاقوامی تنظیموں کو کنٹرول کرنا، تاکہ ایسی تنظیمیں مقصد تک پہنچنے کے لئے مثبت کردار ادا کریں۔ ورنہ یا تو بھلا دی جائیں یا ان کے آگے دیواریں کھڑی کر دی جائیں ۔جیسا کہ حال ہی میں ہم نے دیکھا کہ بہت سی تنظیموں کے ساتھ ایسا سلوک ہوا۔ اگر چہ وہ تنظیمیں امریکہ کے کچھ مقاصد کو پورا کر رہی تھیں لیکن چوں کہ امریکہ کا براہ راست اثر ورسوخ نہیں تھا لہٰذا امریکہ نے ان کے خلاف منفی رویہ اختیار کر لیا۔

امریکہ ۱۱ ستمبر کے حادثہ کو دستاویز بنا کر اسی کوشش میں لگ گیا کہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بری طاقت منوالے اور دنیا کے تمام ممالک کے سیاسی نظام پر اپنا قبضہ جمالے اور اسے اپنے کنٹرول میں لے آئے۔ دنیا کی قوموں کی تہذیبوں، ان کے اقدار اور رسم و رواج کو اپنے کنٹرول میں لانے کے منصوبے اور دیگر ملکوں کے اجتماعی قوانین میں دخل اندازی کرنا، اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جیسا کہ ہم نے قاہرہ، کوپنہیگن، میکز یکوسٹی، اور پیکنگ کی فیملی کانفرنسوں میں دیکھا کہ امریکہ نے حقوق بشر کی حمایت کا نعرہ لگا کر دوسرے ملکوں کے اجتماعی قوانین میں دخل اندازیاں کیں، اور ان ملکوں میں ہم جنس رائج کرنے کے لئے جنسی حقوق اور بچوں کو گرانے کے جواز اور نسلوں کو برباد کرنے کے لئے پرگننسی (Pregnancy) کے حقوق کی پرزور وکالت کی ہے۔

جہانی سازی کے منفی اثرات

اس تھیوری کے خطرناک منفی اثرات دنیا بھر کی تمام اقوام پر واضح ہو چکے ہیں، اسی لئے جہانی سازی کو جنون آمیز، دھوکہ، جال بچھانے، یا وہ چیز جو نگل جائے یا جسے نگلا جائے جیسے اوصاف سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں تحقیقات بھی مذکورہ منفی اثرات کو مزید ثابت کرتی ہیں۔

۱)۔ عالمی نظام اقتصاد، عالمی پیداوار کے ذخائر۔ بین الاقوامی تجارت اور عالمی مالی مبادلات پر امریکہ اور مغربی طاقت کا تسلط اور قبضہ، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں ۵۰۰، ایسی بڑی کمپنیاں ہیں جو بین الاقوامی

تجارت کا ۷۰ فیصد حصہ اپنے قبضہ میں لئے ہوئے ہیں۔

دنیا کی صرف ۲۰ فیصد آبادی امیر ہے اور باقی ۸۰ فیصد آبادی غربت میں بسر کر رہی ہے اور دوسرے ملکوں کی اعانت اور مدد کی محتاج ہے، ادارہ علمی تجارت کی تاسیس سے ۲۰۰۵ء تک امریکہ کی سالانہ آمدنی کی شرح ۲۰۰ ارب ڈالر سے زیادہ رہی ہے۔ جب کہ انھیں برسوں میں افریقی ممالک کے سالانہ نقصان کی شرح ۲۰۹ ارب ڈالر کے آس پاس رہی ہے۔

۲)۔علمی میڈیا پر امریکہ کا تسلط۔

۳)۔ چھوٹے ملکوں کی حیثیت واعتبار کا تمام ہونا اوران کی ترقی کا رکنا۔

۴)۔ دنیا کی قوموں کی داخلی قانون سازی میں مداخلت، جیسا کہ ہم خاندان وغیرہ سے متعلق کانفرنسوں میں اس کے شاہد رہے ہیں۔

۵)۔ دنیا کے تمام حصوں پر ثقافتی حملے اوران علاقوں میں پائی جانے والی تہذیبوں کو نابود کرنے کی کوشش ،ماورائے جدیدیت کے زمانہ سے ان کی مطابقت نیز دین کے کردار کو کالعدم قرار دینا جیسا کہ ''جاک دریدا'' فلسفی نے دنیا کے تمام ملکوں سے دینی وتعلیمی اداروں کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔(عبدالعزیز حمودۃ الثقافۃ۔اختیار الثقافۃ الاہرام ۲۰۰۲ ص ۱۳)

ہم اس وقت مشاہدہ کر رہے ہیں کہ مغرب اپنی بعض قدروں مثلاً ڈیموکریسی ،شخصی آزادی اور جنسی آزادی کو مسلّم قدروں کی شکل میں دنیا بھر کے ملکوں میں برآمد کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ ادھر اس نے لائیک مسلک (لامذہبیت) کو ایک انسانی اصل کے عنوان سے جسے چھوڑا نہیں جا سکتا، ذکر کیا ہے۔اس طرح مغرب کے اقتصادی نمونوں کے بارہ میں ثقافتی نقطہ نظر سے گفتگو کی جا سکتی ہے، نیز مختلف میدانوں میں وسیع وموثر ثقافتی حملوں نیز قومی ماہیت کو محو کرنے اور مجازی مصنوعی حیثیت پیدا کرنے کی اس کی کوشش کے بارہ میں بھی گفتگو کی جا سکتی ہے۔

۶)۔ بین الاقوامی اجتماعوں اور اداروں کی وقعت کم کرنا اوران سے بڑی طاقتوں کے حق میں فائدہ اٹھانا مثلاً: بین الاقوامی مالی فنڈ، عالمی بینک اور بقیہ تمام بین الاقوامی اداروں کے ذریعہ ان بڑی طاقتوں کے منافع سے متعلق سیاستوں کو بروئے کار لایا جانا، یہاں تک کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے مغربی ملکوں کے سربراہ نے اعلان کیا کہ ناٹو اور مغربی فوجوں نے بین الاقوامی اداروں سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے عالمی نظم کے اوپر سب سے بڑی ضرب

لگائی ہے۔[1]

۷)۔ بڑی طاقتوں کے ذریعہ زندگی کے ماحول کو آلودہ یا انھیں اپنے منافع کی تکمیل کے لئے تباہ کرنا۔

۸)۔ دنیا کے بعض علاقوں کے سیاسی نقشوں میں تبدیلی لانے کی زبردست کوشش کرنا (جیسے خلیج فارس شمالی افریقہ، روس، تائیوان) جو غالبا ایک جدید سیاست کے تحت انجام پا رہی ہے۔

البتہ اس جہانی سازی کے منفی نتائج بھی ہیں کہ ہم ذیل میں ان کا ذکر کرتے ہیں:

امریکہ کی یک طرفہ جہانی سازی کی راہ میں رکاوٹیں

ہم مطمئن ہیں کہ امریکہ جو اس جہانی سازی کو عملی شکل دینا چاہتا ہے، بہت سے امکانات رکھنے کے باوجود اپنے مقصد تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوگا، کیوں کہ اس راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں کہ ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱)۔ اس جہانی سازی کے مقابل بڑے ملکوں کی مقاومت اور عالمی سطح پر ملکوں کا اتحاد جو ان کے منافع سے ٹکراؤ کا باعث ہوگا۔

۲)۔ دنیا کی قوموں کا ان کی حیثیت اور شناخت کو مسخ کرنے والی اور ان کے ملکوں پر قبضہ کرنے۔ کہ اس جہانی سازی کے باطن میں یہی منصوبہ نظر آتا ہے۔ والی طاقت کے خلاف ڈٹ جانا۔

۳)۔ عالمی سطح پر مختلف میدانوں میں بحران کا پیدا ہونا، خاص طور سے اقتصادی میدانوں میں، مثلا توانائی کا بحران جو ممکن ہے تمام عالمی سسٹموں کو متاثر کر کے رہے گا۔

۱۔ ان غلط استفادوں کے دلائل روز بروز زیادہ ہوتے جا رہے ہیں، اور اگر یہ بین الاقوامی ادارے ان کے لئے مفید نہیں ہوتے تو وہ انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس کا ہم امریکہ کی طرف (کیوٹو) معاہد کے سلسلہ میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو ماحولیات کی آلودگی پر روک لگاتا ہے۔ چوں کہ امریکہ اس بات کی طرف متوجہ تھا کہ اس معاہدہ پر عمل ان کے پتھر کے کوئلے، تیل اور ایٹمی توانائی کی پیداوار میں کمی کا باعث ہوگا۔ جب کہ اس ملک نے ادھر بین الاقوامی عدالت کے ذریعہ اس معاہدہ پر دستخط کئے ہیں اور اس کی تشکیل میں شرکت کی ہے لیکن اپنے فوجیوں کے لئے اس عدالت سے معافی کا اقدام کیا ہے اسی طرح اس نے ایٹمی تجربات پر روک لگانے والے معاہدہ (CTBT) سے بھی نکلنے کی کوشش کی ہے اور کیمیاوی اسلحوں پر پابندی کے معاہدہ سے بھی خود کو دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔

۴)۔ بین الاقوامی تعلقات کے سسٹم کو خراب کرنے کی کوشش جاری رکھنا اور عالمی اداروں کو نظر انداز کرنا امریکہ کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہ بات پوری دنیا کو امریکہ کے خلاف بھڑکا دے گی۔

۵)۔ ان (جہانی سازی کے منصوبوں) سے دنیا کی آگاہی میں اضافہ ہو رہا ہے جو ان منصوبوں سے مقابلہ میں افزائش کا سبب ہوگا۔ جہانی سازی کے لئے استفادہ کئے جانے والے وسائل دنیا کے لوگوں میں آگاہی کا سبب بنیں گے۔

۶)۔ دنیا کی قوموں میں مذہبی آگاہی و بیداری جو اس طرح کے منصوبوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اسلامی حکومت کا عالمی تصور اور مغربی جہانی سازی

اس سے پہلے کہ امت اسلام اس سلسلہ میں کوئی اقدام کرے ہماری کوشش ہوگی کہ اسلامی حکومت کے عالمی تصور اور مغربی جہانی سازی کے درمیان فرق کو خلاصہ کے طور پر ذکر کریں۔

اسلامی حکومت کا عالمی تصور مندرجہ ذیل خصوصیتوں کا حامل ہے:

- اسلام ایسے عالمی پہلو کا حامل ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی کو دنیا کی دوسری قوموں پر نہیں لادتا اور دوسری قوموں کی ثقافت اور طرز زندگی کو صلب کرنے کی فکر نہیں ہے بلکہ باہمی زندگی و مفاہمت کی کوشش کرتا ہے۔ اس چیز کی اسلامی متون (قرآن و احادیث اور ان متون سے ہماہنگ تاریخی روداد وں کے ذریعہ تاکید ہوتی ہے اور اس میں کسی طرح کے عقیدہ کے جبر یا دوسروں کی ثقافت کو مسخ کرنے یا قومی بڑائی کی گنجائش نہیں ہے۔
- اسلام، دوسرے ملکوں کے حقوق سلب کرنے اور ان کے ذخائر کو لوٹنے کی کوشش نہیں کرتا۔
- مادی منافع سے مربوط مفاہیم و خیالات کو شائع و عام کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اپنی روش میں انسانی پیداوار اور عمومی ضرورتوں کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔ خدا کی نعمتوں کا کفران، اشیاء کی تقسیم، پیداوار میں اسراف اور استعمال کی جانے والی عام چیزوں کی تقسیم میں ظلم و ستم نہیں کرتا اور اس کا مقصد انسان کی کرامت و بزرگی اور خوشبختی ہے۔
- اسلامی حکومت کا عالمی تصور دوسرے افراد، گروہ یا معاشروں کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اس کی کوشش یہ رہی ہے کہ حق، حقدار تک پہنچے۔ وہ مختلف میدانوں میں امن و امان کو سب کے لئے فراہم کرتا ہے۔

- اسلامی حکومت کا عالمی تصور اس بات کی کوشش نہیں کرتا کہ ایک قوم یا ایک طبقہ یا ایک فرد کو دوسروں پر تھوپے۔ وہ ہر طرح کی ڈکٹیٹر شپ اور برتری کا مقابلہ کرتا ہے اور اسے طاغوت کے مظاہر کا ایک نمونہ سمجھتا ہے۔ وہ طاغوت سے مقابلہ کو انبیائے کرامؑ کے دو مقصد یعنی زمین پر خدا کی بندگی و عبادت کے ساتھ دوسرا مقصد سمجھتا ہے۔
- اسلامی حکومت کا تصور انسانی قدروں کو عام کرنے اور نیک اخلاق کے رواج کو ایک نا قابل اجتناب مقصد سمجھتا ہے۔
- اس حکومت کا تصور انسانی جلوؤں کو شخصی، اجتماعی اور بین الاقوامی سطح پر نمایاں کرنے کی واقعی و حقیقی کوشش کرنا ہے۔
- فطری عناصر میں سے ایک عدالت ہے کہ دین اسے ہر میدان میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے ،اور جو چیز بھی اس سے منافات رکھتی ہے اسے حذف کر دیتا ہے۔
- اسلامی حکومت کا عالمی تصور دوسروں کا احترام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور باہمی گفتگو کی منطق کو وسعت دیتا ہے۔(لیحیی من حیی علی بینة و یهلک من هلک عن بینة)جو لوگ زندگی چاہتے ہیں انھیں دلائل کی بنیاد پر زندگی کا موقع دیتا ہے اور جو لوگ دلائل و شواہد کی بنیاد پر ہلاکت کی راہ اپناتے ہوں انھیں ہلاک کر دیتا ہے)اور یہ انسانی فطرت کے تقاضوں میں سے ہے۔
- اجتمائی سطح پر تعاون، اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا ہے۔
- انسان اور اس کی مرکزی حیثیت کو عہد و فریضہ کی پابندی اور کام کی بنیاد پر تولتا ہے۔
- فردی آزادی اور اجتماعی منافع کے درمیان توازن برقرار کرتا ہے اور تمام اجتماعی مسائل کو واقعی فلسفہ کی بنیاد پر استوار کرتا ہے۔ اسی راہ پر چلتا ہے اور خود کو ان انسانی خصوصیات کے تقاضوں کا پابند جانتا ہے جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

لیکن مغربی جہانی سازی مذکورہ بالا باتوں کے ٹھیک مخالف ہے۔ یہ جہانی سازی جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا، ثقافتی نفرت، لوٹ مار یا ایک طرح سے وحشیانہ اور دیوانہ وار یا ترقی یافتہ اور ماڈرن خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حیوانی مصرف کی منطق دنیا میں رائج کرے اور دوسرے معاشروں کے تمام امور میں حتی ان کے اجتماعی و شہری امور میں مداخلت کرے۔ اس کا مقصد دوسروں پر تمام میدانوں میں اپنا تسلط کرنا ہے۔ وہ

اخلاقیات کو کوئی وقعت نہیں دیتی بلکہ اخلاق کو اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے لئے بروئے کار لاتی ہے۔

جیسا کہ پچھلے دنوں ہم نے امریکہ کے مفکرین کے بیانیہ میں دیکھا، مغربی ثقافت میں معنوی و روحانی مسائل کی کوئی جگہ نہیں ہے، بلکہ مغرب اپنے تمام وسائل کے ذریعہ من جملہ پروپیگنڈہ مشینریوں اور جنسی آزادی وغیرہ کے ذریعہ معنویت سے مقابلہ کرتا ہے۔ عدالت بھی مغرب کی نظر میں ایک نسبی چیز ہے اور وہ اس طرح کہ اسے ان کے تنگ نظرانہ منافع سے سازگار ہونا چاہئے۔ سرانجام مغربی ثقافت گفتگو کے بجائے وحشیانہ طور پر کشمکش کی منطق کو پیش کرتی ہے۔

جہاں تک معیار عدالت کا سوال ہے تو ان کی طاقت اور تنگ نظر منافع کے علاوہ ان کے یہاں کوئی معیار عدالت نہیں ہے۔ اسی بنا پر وہ دوسروں کے ساتھ دہری سیاست چلتے ہیں، اس معنی میں کہ دوسروں کو انسانی طور سے برابر کا حق حاصل نہیں ہے۔ (ہابز) کے نظریہ کے مطابق ماڈرنزم کی بنیاد پر معاشروں کی تقسیم بندی میں، کہ آج زیادہ تر مغربی مفکرین خصوصا برطانوی اور امریکی مفکرین اس کے پیرو نظر آتے ہیں اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا مغربی جہانی سازی اپنے لئے مناسب شرائط و حالات سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے وحشیانہ حملہ کی کوئی واقعی فلسفی توجیہ ہو۔

آج اسلامی امت کے حالات

آج اسلامی امت نے ایک طولانی مدت کی جنگ کے آثار کو جو دسیوں اور شاید سیکڑوں سال سے جاری تھی خود سے دور کر دیا ہے۔ بعض اسلامی علاقوں مثلا انڈونیشیا میں مغربیوں کا قبضہ تین صدیوں سے زیادہ رہا ہے اور یہ قومیں اس مدت میں بہت سے رنج والم شکستوں اور مختلف لوٹ مار جغرافیائی تاریخی اور زبانی تجزیہ کا شکار اور دینی ہدایت سے محروم رہیں اور برابر مغرب کی غیر مذہبی اور ٹکراؤ رکھنے والی تعلیمات سے روبرو رہیں۔ بیسویں صدی میں بھی غفلت خیانت اور منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی مشکلات سے دوچار رہیں۔ اس کے باوجود اس وقت یہ قومیں ان سے بڑے خطروں میں گرفتار ہوئی ہیں جن میں ان کے ثقافتی و تہذیبی وجود کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

ان حالات میں اسلامی امت کون سے اقدامات کر سکتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں بڑی حد تک مسلمان جنگ احد کی شکست کے بعد سے ملتے جلتے حالات سے دوچار ہیں۔ اس زمانہ میں مسلمان جنگ کے زخموں کے درد، تفرقہ، نفاق، عقائد میں شبہ جیسے حالات میں مبتلا تھے، لیکن مسلمانوں کے رہبر حضرت پیغمبر اکرم صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ احد میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو ایک بار پھر جنگ کے لئے آمادہ کرتے ہیں اس طرح قریش کے دل میں خوف و وحشت ڈال دیتے ہیں اور انھیں دوبارہ حملہ سے روک دیتے ہیں۔

ہمیں ان حالات، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصوبوں اور اس زمانہ کی تعلیمات قرآن کا جائزہ لینا چاہئے اور ان سے موجودہ حالات میں فائدہ اٹھانا چاہئے۔

خداوند عالم نے احد کے دن سورہ آل عمران کی ساٹھ (۶۰) آیتیں نازل کیں، اس طرح سے کہ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں لکھا:

"**فیھا صفة ما کان فی یومھم ذلک و معاتبة من عاتب منھم**" (سیرہ ابن ہشام، ج ۳ ص ۱۱۲)

درس عبرت اور جنگ احد کے واقعات کا جائزہ حسب ذیل انداز میں کیا جاسکتا ہے:

- دشمن کی طرف سے پھیلائی جانے والی افواہیں، جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو جنگ کے لئے آمادہ کر رہے تھے، جو اس بات کا سبب ہوئیں کہ مسلمانوں کے دو گروہ اپنے عقائد اور خدا پر توکل کو فراموش کر بیٹھتے ہیں اور شکست و ناکامی سے دوچار ہوجاتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وعدہ انھیں صحیح راہ اور نجات کی طرف واپس لاتا ہے۔
- ایمان کی پابندی کامیابی کا راز ہے اور یہ مسئلہ تاریخی سنتوں کا حصہ ہے۔ (آیت ۱۳۷ سورہ آل عمران)
- معنویات کی تقویت کا مسئلہ اور یہ کہ مومن اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ بدن پر زخم کھانے کے بعد بھی کامیاب ہے اور شکست و فتح خدا کے ہاتھ میں ہے جسے کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے آزمائش و آگاہی اور کافروں کے لئے زوال اور بکھراؤ کا باعث بنا ہے۔ (آیات ۱۴۰۔۱۳۹)
- رسالت پر ایمان اور اس پر ثابت قدم رہنا، کیوں کہ یہ عمل رسالت کی نعمت پر شکر کا مقتضی ہے۔ (آیت ۱۴۴)
- جوش و جذبہ اور بہادری نیز راہ ایمان پر امید و پائداری، وعدۂ الٰہی کا انتظار اور دشمن کے وعدوں سے دور رہنا اور فریب نہ کھانا۔ (آیات ۱۵۱۔۱۴۶)
- اللہ کا وعدہ حقیقی وعدہ ہے کہ مسلمان جس وقت اس کی راہ پر گامزن تھے انھوں نے اس کے وعدہ کو پورا

ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔لیکن جب صبر وتقوا کو جو کامیابی کی شرط تھی، کھو بیٹھے تو شکست کی آزمائش سے دوچار ہوئے۔(آیت/۱۵۲)

- بعض مسلمانوں کی جلد بازی، تھوڑے سے منافع کی طرف بھاگنا، رہبر کے منصوبہ کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنا، موت کا خوف، شیطان کے وسوسوں کی طرف توجہ کے نتیجہ میں شکست۔قرآن کریم ایک بار پھر ان کو اللہ کی قدرت، کامیابی کے وعدوں، موت کے معنی اور اجل کے آنے سے آگاہ کرتا ہے اور جاہلیت کے خیالات سے روکتا ہے۔(آیات/۱۵۸۔۱۵۵)

- موجودہ صورت حال کو منظّم کرنے کی دعوت، رہبر وامت کے درمیان طبیعی روابط کا نرمی، رحمت، باہمی مشورت اور مشترکہ ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی بنیاد پر، نئے سرے سے برقرار کرنا، نیز رہبر کی قیادت میں آمادہ شدہ منصوبوں کی طرف خدا پر توکل کے ساتھ قدم بڑھانا۔(آیت/۱۵۹)

- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں، خاص طور سے جنگ احد میں شریک افراد کو واقعہ ''حمراء الاسد'' میں دشمن سے مقابلہ کا حکم دیتے ہیں تاکہ قریش مسلمانوں کے رہبر کے عزم وحوصلہ سے آگاہ ہو جائے اور مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ ترک کردے۔(آیات/۱۷۴۔۱۷۲)

- ہمیں بھی جہانی سازی کے وحشیانہ حملہ سے مقابلے کے لئے ان تاریخی واقعات سے عبرت اور سبق حاصل کرنا چاہئے۔

اسلامی امت کا موقف اور جہانی سازی کے مقابل اٹھائے جانے والے قدم

ان اقدامات کے ذکر سے پہلے اس نکتہ پر تاکید ضروری ہے کہ جہانی سازی اور اس کی مختلف شکلوں میں

ان اقدامات کے ذکر سے پہلے اس نکتہ پر تاکید ضروری ہے کہ جہانی سازی اور اس کی مختلف شکلوں کے روبرو انفعالی مخالفت بے نتیجہ ہوگی۔کیوں کہ جہانی سازی کی بعض قسمیں ترقی پسند حالت کی حامل ہیں۔لہٰذا بہت سوچ سمجھ کر اس عظیم عالمی حملہ کے منفی پہلوؤں کے خلاف طے شدہ عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔

ایک واضح وروشن عملی راہ حل کا اقدام جس میں سب شریک ہوں اور اس پر عمل کریں نیز ان نظریات کی وضاحت، جنھوں نے اس تخریبی نقطہ نظر کو وجود میں لانے کے لئے زمین ہموار کی ہے، بہت مفید اور راہ گشا ہوں گے۔

الف)۔عالمی سطح پر

۱)۔امریکی تسلط کے نظریاتی پہلوؤں اوراس سلسلہ میں اس کے اصل مقاصد(مثلاً عالمی گاؤں، بازار کی آزادی، دوسروں کے معاملات میں مداخلت کی آزادی، سرحدوں کا کھولا جانا وغیرہ کو واضح اور رسوا کیا جائے۔

۲)۔بازار کے تسلط کو سیاسی پہلو پر اس کے تمام مظاہر کے ساتھ روکا جانا چاہئے اور اسے حذف کرنے کے لئے سنجیدگی کے ساتھ منصوبہ بندی کرنا چاہئے۔

۳)۔انسان کی فطری قدر و منزلت میں اضافہ کے لئے اسلامی فطرت کے نظریہ کو پیش کرنا۔

۴)۔علاقائی ماہیت و شناخت اور دنیا کی قوموں کی ماہیت کو برقرار رکھنے پر زور دینا اور انھیں آگاہ کرنا کہ اپنی اور اپنی تہذیب کی حفاظت کریں۔

۵)۔قوموں کی علمی توانائی اور ترقی کو بلند کرنا

۶)۔قوموں کو ان کی آزادی اور ان کے اصلی حقوق دلانے کی کوشش کرنا۔

۷)۔بین الاقوامی اداروں کو مضبوط کرنا اور ان کی عملی مستقل مزاجی میں اضافہ کرنا۔

۸)۔مختلف و رنگارنگ تہذیبی منابع و مآخذ میں گہرائی لانا۔

ب)۔اسلامی ملکوں کی سطح پر

۱)۔عالمی اسلامی اداروں کو مضبوط کرنا اور سیاسی، اقتصادی و ثقافتی میدانوں میں انھیں فعال بنانا۔

۲)۔علاقائی و عالمی مطالعات کے سلسلہ میں تغیر لانا اور تاریخ پر توجہ دینا۔

۳)۔استقامت و پایداری، تعاون و اتحاد کے تمام عوامل کو تقویت دینا مثلاً عربی زبان کی تعلیم و تحصیل کو ضروری قرار دینا، معنویات کو زندہ کرنا جو ہمیں ہمارے دشمن سے ممتاز اور جدا کرتی ہے۔خداوند عالم سورہ نساء آیت ر ۱۰۴ میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿ولا تهنوا فی ابتغاء القوم ان تکونوا تالمون فانّهم یألمون کما تألمون و ترجون من اللّٰه ما لا یرجون و کان اللّٰه علیماً حکیماً﴾

''سستی نہ کرو، اگر تم رنج والم میں رہو گے تو وہ بھی تمھاری طرح رنج والم میں رہیں گے تم خدا سے اس چیز کی امید رکھتے ہو مگر وہ اس چیز کی امید نہیں رکھتے اور خدا بہت دانا و

حکمت والا ہے''

۴)۔اسلامی قیادت و رہبری کی کیفیت کو اپنی طبیعی و صحیح حالت پر لانا اور امت و رہبر کے معاملہ کو نرمی و محبت کی بنیاد پر استوار کرنا۔

۵)۔زندگی و موت، تہذیب و تمدن، خدا سے رابطہ، اس کی طاقت وقدرت پر ایمان، اللہ پر بھروسہ اور ایک دوسرے سے ٹکراو نہ رکھنے جیسی قدروں کو فروغ دینا۔

۶)۔معاشرہ میں تمام اعتبار سے باہم مشورہ کرنے کی عادت کو عام و رائج کرنا۔

۷)۔اسلام کے انسانی حقوق پر پوری توجہ و باریکی کے ساتھ عمل کرنا۔

۸)۔دھمکیوں کو بہترین موقعوں میں تبدیل کرنے کے لئے اقدام کرنا۔سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۷۳ میں آیا ہے:

﴿الّذین قال لهم النّاس ان النّاس قد جمعوا لكم فاخشوهم فزادهم ايماناً و قالوا حسبنا اللّه و نعم الوكيل﴾

''وہ مومنین کہ جب لوگوں (منافقوں) نے ان سے کہا کہ تمھارے لئے بہت بڑا لشکر تیار ہوا ہے، لہٰذا ان سے ڈرو تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا اور انھوں نے کہا کہ خدا ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے''

۹)۔اس عظیم عالمی حملہ کے مقابلہ میں اپنی حقیقت و اصل پر توجہ، نئی ایجادات اور مذہبی تحقیقات میں اجتماعی اجتہاد کی طرف توجہ دینا اور استقامت و پائداری اختیار کرنا۔

۱۰)۔اسلامی بیداری کی حمایت کرنا۔

آخر میں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ایک دوسری جہانی سازی بھی وسعت اختیار کر رہی ہے اور وہ ہے معنویات کی طرف لوگوں کا رجحان اور دنیا کی قوموں میں دینداری کی روح کا پیدا ہونا۔ مذہبی رہنماؤں کے درمیان تفاہم کا پیدا ہونا، خاص طور سے عالم اسلام میں ہمہ جہت افہام وتفہیم کی فضا قائم ہو رہی ہے۔ایسی فضا جو اس قوم کو اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچا کر رہے گی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عالمی سطح پر معنویات کی طرف میلان روز بروز بڑھتا جائے گا۔ چنانچہ حسب ذیل موارد

اس ادعا کی تائید کرتے ہیں:

الف: عالم اسلام میں لوگ دینداری کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور علمائے دین سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ لوگوں کی عمومی زندگی میں دخیل ہوں اور ان کے مسائل کا حل پیش کریں۔

ب: عیسائی دنیا میں سیاسی و اجتماعی میدانوں میں کلیسا کے کردار کا محکم ہونا، خاص طور سے ان ملکوں میں جو روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد وجود میں آئے نیز جنوبی ایشیا میں اجتماعی فیصلے کرنے کے سلسلہ میں بدھ مذہب کے رہنماؤں کو آزادی حاصل ہونا۔

ج: لوگوں میں دینی کتابوں اور دینی نظریات کی طرف رجحان میں اضافہ ہونا۔

د: ادھر اقوام متحدہ کا مذہبی رہنماؤں کی طرف توجہ دینا جیسا کہ ہم نے نیویارک اور بینکاک کی کانفرنسوں میں مشاہدہ کیا۔

ھ: مختلف ادیان و مذاہب میں باہم گفتگو کا وسعت پانا۔

منابع و مآخذ

۱۔ قرآن

۲۔ جیمس روزناؤ، دینامیکیہ المعرفۃ

۳۔ ڈاکٹر عبدالعزیز حمودۃ، الثقافۃ۔ اختیار الثقافۃ القومیۃ الاہرام ۲۰۰۲

۴۔ کانفرنس جمعیت وتوسعہ قاہرہ و پیامد ہای آن، نوشتہ مولف

۵۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۳/ دار احیاء التراث

۶۔ مجد الدین حمشی، العربی، شمارہ ۵۱۲

۷۔ مجلّہ المنہاج، شمارہ ۲۲، سال ششم

۸۔ مجلّہ النہج، شمارہ۔ ۵۰ بہار سال ۱۹۸۸

۹۔ مجلّہ الواحۃ شمارہ۔ ۱۶۔

اتحاد کے اچھے اور تفرقہ کے برے آثار

عبدالکریم بے آزار شیرازی
ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"گزشتہ امتیں جب تک باہم اور متحد تھیں پیہم ترقی کی راہ پر گامزن تھیں اور عزت و اقتدار اور زمین کی خلافت و وراثت سے ہمکنار رہیں اور دنیا والوں کی رہبر اور ان پر حاکم رہیں۔ لیکن جب انھوں نے خدا کو فراموش کر دیا، مادیات کی طرف مائل ہوئے، احساس برتری، قومی و فرقہ ورانہ انتشار و براگندگی کا شکار ہو گئے، آپس میں لڑنے لگے تو خداوند عالم نے عزت و بزرگی اور خلافت کا لباس ان کے جسم سے اتار لیا، خیر و برکت اور نعمتوں کی فروانی ان سے سلب کر لی اور ذلت و غلامی میں انھیں مبتلا کر دیا۔ مثال کے طور پر کسریٰ و قیصر بنی اسرائیل میں تفرقہ کی وجہ سے ان پر مسلط ہو گئے۔ انھیں اپنا غلام بنا لیا اور آباد زمینوں اور دجلہ و فرات کے سرسبز و شاداب علاقوں سے نکال کر بیابانوں اور بے آب و گیاہ علاقوں میں ڈھکیل دیا اور انھیں ذلت و فقر جہالت و انتشار سے دو چار کر دیا۔

خداوند عالم نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام جیسی نعمتوں کے ذریعہ اولاد اسماعیل اور تمام مسلمانوں کو متحد اور بھائی بھائی بنا دیا، انھیں بزرگی عطا فرمائی اپنی

عطاؤں کی نہریں ان کی طرف جاری کیں۔ انھیں نعمت طاقت، عزت وعظمت عطا
فرمائی ایسی پایدار حکومت انھیں نصیب کی کہ کسی کو اسے شکست دینے کی طاقت نہ تھی۔
افسوس ایسی باشکوہ ہجرت کے بعد مسلمان مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہوگئے''۔[۱]

نتیجہ میں اسلامی امت نے قوم وقبیلہ پرستی اختیار کرلی اور حضرت علی علیہ السلام کی تعبیر میں ہجرت کے بعد تعرب وعروبت یعنی قومیت اختیار کرلی۔

عصر پیغمبرؐ میں اتحاد وہمبستگی کے درخشاں آثار

مدینہ میں رہنے والے قبائل عرصہ دراز سے ایک دوسرے سے اختلاف وجھگڑا رکھتے تھے اور یہودیوں نے ان کے اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر سیاسی غلبہ وتسلط حاصل کرلیا تھا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت کرنے اور لوگوں کی قیادت ورہبری قبول کرنے کے بعد ان کے درمیان اخوت وبرادری کا معاہدہ قائم کیا۔[۲]

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب ''حیات پیغمبرؐ'' میں لکھا ہے: یہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے جس کی نظیر گزشتہ انبیاء کے یہاں نظر نہیں آتی۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے مشورہ کیا اور سب سے پہلا موضوع جس پر آپ نے توجہ فرمائی یہ تھی تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنادیا۔

ہیکل مزید لکھتے ہیں: اگر ہم اس بات کو مدنظر رکھیں کہ منافقوں نے قبائل اوس، خزرج اور مہاجر وانصار کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کی کس قدر کوششیں کیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس سلسلہ میں کس قدر دقت نظر، حسن تشخیص اور دوراندیشی سے کام لیا تھا۔[۳]

قرآن مجید مسلمانوں سے تاکید کرتا ہے:

''واعتموا بحبل اللّٰہ جمیعا و لا تفرقوا و اذکروا نعمت اللّٰہ علیکم

....

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ/۵

۲۔ السیرۃ النبویہ، لابن ہشام، ج/ص/۵۰۱

۳۔ Mohammad Husain Haykal & The life of Mohammad Translated by Ismail Rahia & Alfarugi . p 177

اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا و کنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها ...''

تم سب اللہ کی رسی (قرآن و اسلام وتمام وسائل اتحاد) مضبوطی سے پکڑے رہو اور متفرق و پراگندہ نہ ہو اور خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ کس طرح تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمھارے دلوں میں محبت پیدا کر دی اور اس نعمت کی برکت سے تم ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے۔ تم آگ کے گڑھے کے دہانے پر تھے کہ خدا نے تمھیں اس سے نجات عطا کر دی۔[1]

اللہ کی اس عظیم نعمت کے سایہ میں مسلمان تھوڑی سی تعداد ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں پر فاتح ہو گئے لیکن جنگ احد میں اختلاف ونزاع کے باعث شکست سے دوچار ہوئے۔

''و لقد صدقکم الله وعده اذ تحسونهم باذنه حتی اذا فشلتم و تنازعتم فی الامر''

خداوند عالم نے تم سے (احد میں دشمن پر کامیابی کے سلسلہ میں) وعدہ کو پورا کیا۔ جب کہ تم (آغاز جنگ میں) اس (اللہ) کے حکم سے دشمنوں کو قتل کر رہے تھے (اور یہ کامیابی جاری تھی) یہاں تک تم سست ہو گئے اور (مورچہ چھوڑ دینے کے سلسلہ میں) باہم نزاع کرنے لگے۔[2]

عصر خلفاء میں اتحاد وترقی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ امام علیؑ نے اپنی عالی ظرفی کی بنا پر ظاہری خلافت سے بالاتر وظیفہ پر عمل شروع کیا اور جنگ وجدال، مسلمانوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے یا سازشیوں سے باز ساز کرنے کے بجائے تقوائے الٰہی کے ساتھ لوگوں کو باہم متحد ہونے کی دعوت دی، اور جو لوگ دانستہ یا نادانستہ طور پر حضرت ابو بکر کے مقابلہ میں ان کی بیعت کرنے آئے تھے، ان سے فرمایا:

....

۱۔ آل عمران/۱۰۳

۲۔ آل عمران/۱۵۲

''ایھا الناس شقوا امواج الفتن بسفن النجاۃ ، و عرجوا عن طریق المنافرۃ ، و ضعوا تیجان المفاخرۃ ، افلح من نھض بجناح ، او استسلم فاراح ، ھذا ماء اجن ، و لقمۃ یغص بھا اکلھا ، و مجتنی الثمرۃ لغیر وقت ایناعھا کالزارع بغیر ارضہ''

اے لوگو! فتنہ کی موجوں کو سینہ نجات (علم، ایمان اور اتحاد) کی کشتیوں سے چاک کردو اور اختلاف و پراگندگی کی راہ سے دوری اختیار کرو۔ باہمی تفاخر، اظہار برتری کے تاج کو سروں سے اتار دو۔ وہ کامیاب ہوا جو اپنے ناصر و مددگار اور کافی طاقت اٹھا اور جس شخص نے کافی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے کنارہ گیری اختیار کی اس نے لوگوں کو سکون بخشا۔

''لوگوں پر حکومت کرنا ایسا بدبودار پانی یا ایسا لقمہ ہے جو گلوگیر ہو جاتا ہے جو لوگ پھلوں کو پکنے سے پہلے توڑ لیتے ہیں وہ ان لوگوں کے مانند ہیں جو ریگستان اور شورہ زار زمین میں بیج بوتے ہیں۔ [۱]

حضرت علی علیہ السلام کا مقصد صرف اسلام کی حفاظت اور اس اساس اتحاد کو محفوظ کرنا تھا اسی لئے آپ نے خلفاء کے ساتھ تعاون کیا اور چوں کہ آپ کی روح اس سے بالاتر تھی کہ دنیاوی عہدہ ومنصب کی خاطر کسی کا کینہ دل میں رکھتے لہذا ان کے ہمراہ بھرپور تعاون کرتے تھے۔ اس انقلابی صبر کے نتیجہ میں مسلمانوں کے درمیان ایسا اتحاد وجود میں آیا کہ مسلمان داخلی سطح پر اختلاف و جنگ کے بجائے اسلام کے عظیم انقلاب کو اپنی سرحدوں کے باہر صادر کرنے لگے۔

یہی اتحاد مسلمانوں کی کامیابی اور ترقی کا باعث ہوا۔ یہاں تک کہ انھوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں روم اور فارسی کی سلطنتوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرلیا اور مصر عراق و فلسطین پر بھی قبضہ کرلیا۔ اگر حضرت علی علیہ السلام نے یہ اتحاد اور ماحول کو یہ سکون نہ بخشا ہوتا تو محال تھا کہ مسلمانوں کو یہ ترقی اور یہ فتوحات حاصل ہوتیں۔۔۔

لیکن جب حضرت نے لوگوں کے بے حد اصرار پر خلافت کی باگڈور اپنے ہاتھ میں لی تو آپ کے بعض رقیبوں اور نادان و تنگ نظر دوستوں نے اس اتحاد و سکون کو باقی رکھنے کے بجائے اختلاف اور جھگڑے کو ہوا دی، نتیجہ

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ/۵

میں مسلمانوں کو ترقی سے محروم کر دیا اور داخلی جنگوں میں برادر کشی پر مجبور کر دیا اور ہزاروں لوگوں کو اس تفرقہ کے گھاٹ اتار دیا۔

عصر اموی اور مسلمانوں کا اختلاف انحطاط

حضرت علی علیہ السلام اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی بڑے ادب کا سلوک کرتے تھے اور ان پر لعن وتکفیر کے بجائے فرماتے تھے:

''انا لم تقاتلهم على التكفير لهم و لم تقاتلهم على التكفير لنا ، و الكنرا ينا انا على حق و راوا اجهم على حق'' [1]

ہماری جنگ ایک دوسرے کے ساتھ اس بنیاد پر نہیں تھی کہ ہم انھیں کافر جانیں یا وہ ہم کو کافر جانیں بلکہ ہماری نظر اس پر تھی کہ ہم حق پر ہیں اور وہ یہ دیکھتے تھے کہ وہ حق پر ہیں''

حتیٰ معاویہ کی فوج کے سلسلہ میں جب آپ نے سنا کہ بعض شیعہ ان پر سب لعن کر رہے ہیں تو فرمایا:'' انی اکرہ لکم ان تکونوا سبابین'' (مجھے پسند نہیں ہے کہ تم گالیاں دینے والے بنو۔ ہاں اگر ان کے کردار کو یاد کرتے اور ان کی گمراہیوں و ناپسندیدہ کردار کا ذکر کرتے تو سچائی سے نزدیک اور معذور تر ہوتے) [2]

اتنے ادب وانصاف اور عاقلانہ روش کے باوجود جب بنی امیہ نے مسلمانوں کی باگڈور ہاتھ میں لی تو عالم اسلام کے تمام امام جمعہ و جماعات کو حکم دیا کہ حضرت علی علیہ السلام کو منبروں سے سب ولعن کریں۔ [3] یہ جاہلانہ روش امام علی علیہ السلام کے دوستداروں کے جذبات کے بھڑکنے کی باعث ہوئی اور اس نے بہت سے لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کے ارشاد کے برخلاف برابر کے مقابلہ پر اتر آئیں اور سب ولعن کو اپنا معمول بنائیں جس کے نتیجہ میں تاریخ میں لاکھوں کروڑوں مسلمان قتل ہو گئے۔

۱۔ قرب الاسناد حمیری، تہران مکتبہ نبوی، بی تا ص/۴۵

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ/۲۰۶

۳۔ تاریخ خلفاء، سیوطی، قاہرہ دار الفکر العربی، ص/۲۷۹

ہر چند کہ عمر ابن عبدالعزیز نے امام علیہ السلام پر کئے جانے والے لعن پر پابندی لگائی ۱ ؎ لیکن اس سب ولعن کے اثرات آج تک مسلمانوں کے درمیان تفرقہ کا سب سے بڑا عامل وسبب بنے ہوئے ہیں۔

تفرقہ کا دوسرا سبب جو بنی امیہ کے زوال اور مسلمانوں کے انحطاط کی شکل میں برامد ہوا وہ معاویہ کے ذریعہ لوگوں سے اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعت لینا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت ورہبری عوامی حیثیت سے نکل کر سلطنتی شکل اختیار کرگئی اور مسلمان اختلاف کا شکار ہوگئے۔ معاویہ نے اہل شام یزید کی بیعت لینے کے بعد مروان کو خط لکھا کہ اہل مدینہ سے بھی بیعت لے لے۔ مروان نے اہل مدینہ سے خطاب کرکے کہا: امیرالمومنین یہ چاہتے ہیں کہ وہ ابوبکر وعمر کی سنت پر اپنے بیٹے یزید کو تم سب پر خلیفہ بنائیں، عبدالرحمان ابن ابوبکر نے اٹھ کر کہا: قیصر وکسریٰ کی سنت پر ابوبکر وعمر نے ہرگز خلافت کو اپنی اولاد یا اپنے خاندان کی کسی فرد میں منتقل نہیں کیا۔ ۲ ؎

عبداللہ ابن عمر نے بھی حج کے دوران معاویہ سے کہا: تم سے پہلے بھی خلفاء تھے جن کے بیٹے تھے اور تیرا بیٹا ان کے بیٹوں سے بہتر نہ تھا، اوران لوگوں نے بھی اپنے بیٹوں کے لئے جیسا تو نے چاہا نہیں چاہا۔

عبداللہ بن زبیر نے بھی مخالفت کی۔ جب معاویہ مرگیا تو اہل شام نے یزید کی بیعت کی یزید نے کسی کو مدینہ بھیجا تا کہ اہل مدینہ سے اس کے لئے بیعت لے، لیکن امام حسین علیہ السلام اور ابن زبیر نے بیعت سے انکار کیا اور شب کی تاریکی میں مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔

اہل کوفہ نے معاویہ کے زمانہ میں امام حسین علیہ السلام کو دعوت دی تھی کہ آپ معاویہ کے خلاف قیام کیجئے...اور جب یزید کی بیعت لے لی گئی تو حضرت کوفہ روانہ ہوئے اور انقلاب کربلا برپا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اہل سنت کے عظیم مورخ محمد عبداللہ عنان نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

''بنی امیہ اہل بیتؑ اور شیعوں کے حق میں انتہائی بہیمانہ جرائم کے مرتکب ہوئے۔ امام حسین علیہ السلام کی شہادت نے عالم اسلام پر بہت برا اثر ڈالا، یہاں تک کہ اہل مدینہ نے یزید کی اطاعت سے انکار کردیا۔ مختلف علاقوں میں مسلمانوں خصوصا شیعوں کے درمیان بنی امیہ کے خلاف انتاغم وغصہ بھڑکا کہ جس کے سبب بنی امیہ کی حکومت کو زوال آگیا اور مسلمانوں میں انحطاط پیدا ہوگیا۔

۱۔ تاریخ خلفاء، سیوطی، قاہرہ دارالفکر العربی، ص/۲۷۹

۲۔ تاریخ خلفاء، سیوطی، قاہرہ دارالفکر العربی، ص/۲۲۳

عصر اموی میں مسلمانوں کے زوال وانحطاط کے بارہ میں سید محمد رشید رضا نے تفسیر ''المنار'' میں نقل کیا ہے کہ جرمنی کے ایک بڑے دانشور نے ''استانہ'' میں بعض مسلمانوں کے درمیان جن میں مکہ کا ایک برگزیدہ شخص بھی تھا کہا: ہمیں میدان برلن میں معاویہ کا سونے کا مجسمہ نصب کرنا چاہئے۔ لوگوں نے اس سے وجہ پوچھی تو کہا: اس لئے کہ اس نے نظام حکومت کو عوامی جمہوری حالت سے نکال کر قومی تعصّباتی واستبدادی نظام میں تبدیل کر دیا اگر ایسا نہ ہوتا تو اسلام پوری دنیا میں پھیل چکا ہوتا اور اس وقت ہم تمام اہل جرمنی اور یورپ کی تمام قومیں مسلمان اور عربی زبان بول رہی ہوتیں۔[۱]

عصر مامون میں میں اختلاف وانحطاط

ہارون اور مامون کے زمانہ میں مسلمان متعدد فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور شدید تعصّبات کے ساتھ ایک دوسرے سے اختلاف پر اتر آئے تھے کہ آیا قرآن قدیم ہے یا حادث اور....

عبداللہ مامون نے سوچا کہ تمام دینی فرقوں کی ایک مجلس مناظرہ تشکیل دی جائے تا کہ یہ لوگ اختلافی مسائل میں باہم بحث کریں اور مخالف کو مطمئن کر کے یا اس سے مطمئن ہو کر باہمی اختلافات کو ختم کر دیں۔ اس کام کے لئے اس نے اپنے قاضی القضاۃ یحی ابن اکثم کو حکم دیا کہ تمام فرقوں کے علماء کو جمع کرے۔ یحیٰ نے مختلف فرقوں کے چالیس علماء کا انتخاب کیا۔ مامون ان کے درمیان بیٹھا اور برسوں اس بحث ومناظرہ کا سلسلہ چلتا رہا۔ افسوس کہ تعصب اور بغض وعناد ان پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ اپنی بات دوسروں سے منوالے۔ جب مامون نے دیکھا کہ اس طرح مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے تو وہ طاقت کا استعمال کرنے پر آمادہ ہوا اور اس نے جبر و اکراہ اہل سنت سے یہ منوایا کہ قرآن حادث اور مخلوق ہے۔

یہ امر مسلمانوں کے درمیان مزید اختلاف کا باعث ہوا اور اس کے زمانہ میں حکومت صرف اسی کام میں مشغول ہو گئی اور بہت سے مفید کاموں سے رہ گئی، اور ایک نقصان دہ مسئلہ میں طویل مدت تک اختلاف کے ساتھ حکومت اور مسلمانوں کا وقت ضائع ہوا [۲]۔ مامون کے زمانہ سے عباسی حکومت انحطاط کی طرف مائل ہوئی اور عباسی پھر اپنی پہلی جیسی طاقت وقوت کو محفوظ نہ رکھ سکے۔

۱۔ تفسیر المنار، سید محمد رشید رضا، ج ۶/ ص ۷/ ۴۶۷

۲۔ تاریخ الخلفاء سیوطی، ص ۷/ ۳۵۷، ۳۶۲۔ تفصیل سے ان اختلافات کا ذکر موجود ہے۔

آل بویہ کے زمانہ میں ترقی اور انحطاط

آل بویہ، ایرانی، نژاد اور شیعی سلسلۂ حکومت تھا۔ یہ لوگ ۳۲۲ھ سے ۴۴۸ھ تک ایران عراق اور شام کی شمالی سرحدوں تک پورے جزیرۃ العرب پر حاکم تھے۔ یہ لوگ جب تک اتحاد کی راہ پر چلے اور بغداد میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان اختلافات اور خونین جھگڑوں کو برطرف اور ختم کرنے میں کوشاں رہے اور تفرقہ پھیلانے والے واعظوں مبلغوں اور قصہ گو افراد کو مسجدوں اور کوچوں سے دور کرتے رہے، [1] حالات برابر مسلمانوں کی ترقی، عزت و سربلندی کی طرف مائل رہے۔ اسلامی ممالک میں عمران و آبادی وسیع پیمانہ پر عمل میں آتی رہی اور ان کے ذریعہ اسلامی تمدن کو بڑی وسعت ملی۔

عضد الدولہ نے بغداد میں عضدی ہسپتال بنایا جس میں حکماء و اطباء بیماروں کا علاج کرنے کے علاوہ علم طب کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اسی کے حکم سے فارس میں ''کر'' ندی پر ایک بند بنایا گیا، جس سے زراعت کو بڑی وسعت و ترقی ہوئی۔ ابوعلی سینا جیسا حکیم اپنی اواخر عمر میں ہمدان میں آل بویہ کا وزیر مقرر رہا۔

افسوس کہ عضد الدولہ کے بعد آل بویہ میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ آپس میں لڑنے لگے۔ جس وقت آل بویہ آپس میں لڑ رہے تھے غزنی کے ترکوں نے مضبوط حکومت قائم کرکے ان لوگوں کی بہت سی زمینوں اور علاقوں پر قبضہ کر لیا ان کے بعد سلجوقی ترک برسر اقتدار آئے اور انھوں نے پانچویں صدی کے اواخر میں آل بویہ کی تمام حکومت کا خاتمہ کر دیا اور شیعوں کا قتل عام کر ڈالا۔[2]

عہد حمدانیان میں باہمی تقریب اور ترقی

شہر حلب ہوا میں ایک پر کے مانند بغداد کے خلیفہ عباسی اور کبھی مصر و دمشق کے اخشید یان کے درمیان ڈول رہا تھا۔ سیف الدولہ حمدانی (۳۰۳۔۳۵۶ھ) جو شیعہ مذہب امراء میں سے تھا اس نے اپنے بھائی ناصر الدولہ سے مل کر بہت سے علاقوں پر قبضہ کیا۔ اس نے اپنے بھائی، جو خلیفہ المتقی کا امیر الامراء سے ایک ولایت کی درخواست کی اور ناصر الدولہ نے شام کی ولایت ہزار جنگجوؤں کے ہمراہ اس کے سپرد کی۔ سیف الدولہ نے حلب کا رخ کیا اور ۳۳۳ھ میں بلا کسی مزاحمت کے حلب میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے دمشق کا رخ کیا اور اسے

۱۔ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، ج ۲/ص ۶۲۹

۲۔ الشیعہ فی المیزان، محمد جواد مغنیہ، دار التعارف للمطبوعات ۱۳۹۹ھ، ص ۱۴۷

اخشید یوں سے واپس لے لیا۔ کچھ عرصہ جنگ کے بعد آخر کار دونوں میں صلح ہوگئی۔ سیف الدولہ نے اخشید کی بیٹی فاطمہ سے شادی کرلی اور یہ طے پایا کہ حلب حمص اور انطاکیہ سیف الدولہ کے قبضہ میں ہوں گے اور دمشق اور اس کے ماورا مصر تک کا علاقہ اخشید یوں کے قبضہ میں ہوگا۔

اخشید یان دراصل ایرانی اور سنی مذہب اور حمدانیان عرب اور شیعی مذہب تھے ان دونوں کے درمیان رشتہ اور اتحاد و دونوں حکومتوں کے علاقوں میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان قربت اور مسلمانوں کی ترقی وعظمت کا باعث ہوا۔

حمدانیان کے زمانہ میں شیعوں نے موصل وحلب اور دوسرے علاقوں میں ترقی کی یہاں تک کہ جب عظیم اموی مسجد میں داخل ہوتے تھے اور مسجد کے گنبد کے نچلے حصہ پر نظر ڈالتے تھے تو وہاں معاویہ اور یزید کے ناموں کے بجائے علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے نام نظر آتے تھے۔ اس کے باوجود وہ لوگ کسی کو شیعہ ہونے پر مجبور نہیں کرتے تھے ۔کسی کو مال ومنال کے ذریعہ فریفتہ نہیں کرتے تھے اور دوسروں کو شیعہ کرنے کے لئے ادھر ادھر مبلغ نہیں بھیجتے تھے۔ بلکہ لوگوں کو اسلامی مذاہب میں سے کسی بھی مذہب اور عقیدہ کے انتخاب پر آزاد چھوڑ دیتے تھے اس کے برخلاف امویوں، عباسیوں، ایوبیوں اور ۔۔۔ کا حال یہ تھا کہ وہ لوگوں پر زور زبردستی کرتے تھے۔

اس وجہ سے نہ صرف شیعوں کی بزرگ اور اہم شخصیتیں بلکہ اہل سنت کے بھی بزرگ اور اہل علم افراد مثلاً متنبّی، ابوفراس حمدانی اور ابونصر فارابی جیسے افراد نے بھی اس دیار کا رخ کیا اور ابوالفرج اصفہانی نے اپنے کتاب'' الاغانی'' سیف الدولہ کے نام تقدیم کی۔

اس سکون وآرام کی فضا میں سیف الدولہ کے عہد میں اسلامی علوم وآداب نے بڑی رونق پائی۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور نہ صرف یہ لوگ روم میں بعض فتوحات سے ہمکنار ہوئے بلکہ اپنی زمینوں کو بھی خوب شاد وآباد کیا۔

لیکن افسوس'' ایوبی'' اندھا تعصب اپنے ساتھ مصر اور شام لے گئے اور مسلمانوں کو بری طرح سے اختلاف کا شکار اور برادرکشی پر آمادہ کیا اور یہ کوشش کی کہ شیعوں کی نسل کا زمین سے خاتمہ کردیں۔[۱]

۱۔الشیعہ فی المیزان، محمد جواد مغنیہ، ص۱۶۴۔۱۷۳

مستعصم کے زمانہ میں مسلمانوں کا اختلاف وزوال

عباسی خلیفہ المستعصم باللہ کے زمانہ میں مسلمان اس قدر اختلافات کا شکار ہوئے کہ بغدادی صاحب کتاب ''الفرق بین الفرق'' کے بقول صرف معتزلہ بائیس فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور تمام مسلمانوں سے اختلاف وجدال میں مصروف تھے کہ آیا علیؑ، ابوبکر سے برتر ہیں یا ابوبکر، علیؑ سے؟ آیا علیؑ عثمان سے افضل ہیں یا اس کے برعکس؟ یا جن لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کی (مثلاً عائشہ، وطلحہ وزبیر) یہ لوگ اہل جہنم ہیں یا نہیں؟ آیا جو شخص امام برحق کے خلاف خروج کرے وہ فاسق ہے یا نہیں اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا یا نہیں۔ اس کی نماز اور روزہ قبول ہے یا نہیں؟

دوسری طرف مستعصم کے بیٹے ابوبکر نے تعصب کی وجہ سے فوج کے ایک حصہ کو شیعوں کے محلّہ ''کرخ'' کو غارت کرنے کے لئے مامور کیا۔ اس لشکر نے بعض سادات بنی ہاشم کو اسیر کیا لڑکوں اور لڑکیوں کو گھروں سے باہر نکالا۔ ابن العلقمی مستعصم کا وزیر جو شیعہ تھا، اس واقعہ سے سخت متاثر ہوا اور اس نے اس غم کی داستان ادھر ادھر لوگوں کو لکھ کر بھیجی اور اس میں اس جابر وظالم حکومت کے زوال کی آرزو کی جس کی بنیاد ظلم پر تھی اور جس نے سیکڑوں ہزاروں ''آل علیؑ'' کو شہید کر ڈالا تھا۔ اس کی یہ آرزو پوری ہوئی اور ہلاکو خاں ایک بڑے لشکر کے ساتھ بغداد کو فتح کرنے آ گیا۔ ایک طولانی محاصرہ کے بعد اس نے شہر پر قبضہ کر لیا اور مستعصم کو جو تمام خلفاء میں ناز ونعمت اور مال و دولت کی کثرت میں سب سے ممتاز اور غرور وتکبر میں مشہور تھا، ہلاک کر ڈالا۔[1]

چوں کہ مسلمان حکم اللہ کے خلاف تفرقہ واختلاف اور برادر کشی میں مبتلا ہو گئے تھے لہٰذا مغلوں کے حملہ نے انھیں یوں کاٹ کر رکھ دیا کہ سیوطی کے بقول تاریخ نے ایسا حملہ نہ کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا اور اس کا موازنہ سکندر کے حملہ سے بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔[2]

یہ وہی زمینی بلا ومصیبت تھی جس کے بارہ میں قرآن کریم تفرقہ رکھنے والوں کو یوں آشکار کرتا ہے:

﴿ ان الذین فرقوا دینهم و کانوا شیعا لست منهم فی شئ ، انما امرهم الی الله ثم ینبئهم بما کانوا یفعلون ﴾[3]

ا۔ یادنامہ علامہ امینی، بہ اہتمام ڈاکٹر سید جعفر شہیدی، محمد رضا حکیمی موسسہ انجام کتاب ۱۳۶۱، ص/ ۲۴۸

۲۔ تاریخ خلفاء سیوطی، ص/ ۵۴۲۔۵۴۳

۳۔ انعام/ ۱۵۹

جن لوگوں نے اپنے دین کو متفرق اور پراکندہ کیا اور مختلف گروہوں (مختلف مذاہب) میں تقسیم ہوئے آپ کا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ان کا واسطہ صرف خدا سے ہے۔اس کے بعد خدا ان کی کرتوتوں کے انجام سے آگاہ کرے گا۔

ترکیہ اور ایران میں اتحاد و ترقی

آٹھویں صدی ہجری کے عثمانی حکومت کے سپاہی مسلمانوں میں اتحاد کی غرض سے برسر کار آئے اور نویں صدی سے عثمانی حکومت یورپ اور صلیبیوں کے مقابلہ میں عظیم اسلامی طاقت کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی اور مغلوں وصلیبیوں کی تباہیوں اور ویرانیوں سے مسلمانوں کے دلوں میں امید کی کرن بن گئی۔

عثمانی خلفاء نے مسلمانوں میں اتحاد وہمبستگی پیدا کرنے کے لئے۔دنیا بھر کے مسلمانوں کو خلافت کے پرچم کے تلے جمع کیا اور وسیع ترقیاں نیز ایشیا اور یورپ کی جنگوں میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔یہاں تک کہ سلطان محمد نے فاتح کا لقب پایا اور ناجی اسلام کے عنوان سے شہرت حاصل کی۔

اہل یورپ اور صلیبی عیسائی مسلمانوں کی اس ترقی واقتدار سے سخت وحشت زدہ تھے وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کر کے ان کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کردیں۔اس کام کے لئے انھوں نے اسلامی فرق و مذاہب کی تحقیق اور تفرقہ انگیز کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔بہت سے عیسائی محقق اور مستشرق کی حیثیت سے اسلامی ممالک میں داخل ہوئے اور پرفریب چہروں سے تفرقہ پیدا کرنے والے طریقوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔حتیٰ اس عنوان سے کہ مسلمان ہوگئے ہیں،مسلمانوں کے درمیان جاتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔بعض لوگ مثلاً آیۃ اللہ بلشر یکی [1] شیخ حسن آلمانی اور شیخ یوسف فرانسوی جیسے لوگوں نے تو علاقائی زبانیں اس طرح سیکھ لی تھیں اور علماء کا لباس یوں پہنتے تھے کہ لوگ ان کی تفرقہ انگیز اور پراسرار تبلیغات سے متاثر ہوجاتے تھے۔

یورپی حکومتیں جو عظیم طاقتور اور متحد عثمانی حکومت سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتی تھیں،انھوں نے بہترین راستہ یہ دیکھا کہ دو مقتدر حکومتوں صفوی وعثمانی حکومتوں میں اختلاف وتفرقہ ڈال دیا جائے۔انھوں نے اپنے وسیع مطالعات کی روشنی میں منصوبہ بندی شروع کی اور ایران سے دوستی وتجارتی روابط برقرار کئے اور جہاں تک ان سے ہوسکا غیر مستقیم طور پر عوام میں نفوذ کیا اور ایران وایشیائے صغیر میں مذہبی وفرقہ وارانہ تعصّبات کو عوام کے درمیان خوب پھیلایا۔

۱۔آیۃ اللہ بلشر یکی کے بارہ میں تاریخ مشروطہ ایران کا مطالعہ کریں۔

برطانوی سفارت خانہ واسطوں کے ذریعہ خود اس بات کا بانی ہوتا تھا کہ ہر روز اور ہر شب نماز کے بعد مسجدوں میں حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے شکستہ پہلو کے سلسلہ میں مصائب پوری آب وتاب کے ساتھ پڑھے جائیں۔ نو ربیع الاول کو عمر ابن سعد سے متعلق جشن کو عمر ابن خطاب سے متعلق کیا جائے اور شیخین پر سب کے وجوب پر علماء کے ذریعہ کتابیں لکھی جائیں۔

ادھر ترکیہ میں درباری مفتیوں کو ان ہی بنیادوں پر تحریک کرتے تھے کہ وہ شیعوں کی تکفیر کریں اور ان کا خون بہانا مباح قرار دیں۔

عثمانیوں اور صفویوں کا اختلاف وانحطاط

نویں صدی ہجری کے اوائل میں صفوی سلسلہ حکومت کی بنیاد پڑی شاہ اسماعیل، اگر چہ اس کے بزرگ ''شیخ صفی الدین اردبیلی''، اہل سنت تھے، لیکن اس نے شیعہ مذہب اختیار کیا اور اسے حکومت کا قانونی مذہب قرار دیا نیز اعلان کیا کہ خلفائے ثلاثہ پر لعن کی اجائے۔۔۔[۱]

سلطان سلیم جو خلافت اور اسلامی اتحاد کا مدعی تھا اس نے شاہ اسماعیل کو توبہ اور ترک لعن کی دعوت دی لیکن شاہ اسماعیل نے اسے قبول نہیں کیا۔ یہ تعصب سبب ہوا کہ ان دونوں عظیم حکومتوں کے درمیان طولانی جنگیں شروع ہوئیں عثمانی دربار کے علماء شیعوں کی تکفیر اور ان کے قتل کو مباح قرار دینے لگے۔ دوسری طرف صفوی دربار کے علماء اہل سنت کو کافر اور خلفاء اور اہل سنت پر تبرا اور سب ولعن کو لوگوں کی نظر میں واجب ظاہر کرنے لگے۔ اس طرح ''چالدران'' کی خونین جنگ کا آغاز ہوا۔ دسیوں ہزار شیعہ قتل ہوگئے اور تبریز پایہ تخت تھا ہاتھ سے نکل گیا۔

عثمانی حکومت ازبکوں ترکمانیوں اور دوسرے طائفوں کو بھی تحریک کرتی تھی کہ ایران پر عثمانی فوج کے حملہ کے وقت وہ بھی چاروں طرف سے ایران پر حملہ کریں۔ دوسری طرف پاپ اور یورپی بادشاہ بھی جو دونوں حکومتوں سے خصومت رکھتے تھے اور عثمانیوں کے خطرہ سے خوف زدہ تھے، برابر یہ کوشش کرتے تھے کہ صفوی بادشاہوں سے روابط قائم کرکے انھیں تقویت پہنچائیں اور عثمانی حکومت کے خلاف اسے تحریک کریں۔ صفوی سلاطین بھی ان کی مدد حاصل کرنے کے لئے اس طرح کے روابط کو مستحکم ومضبوط کرتے تھے۔ یورپ کے سفیروں اور تاجروں کی ایران رفت وآمد اسی سلسلہ میں ہوتی تھی۔[۲]

۱۔ ایران درزمان صفویہ، دکتر احمد تاج بخش، کتاب فروشی تہران ۱۳۴۰ش، ص ۲۱/

۲۔ دائرۃ المعارف فارسی (مصاحب) ۲/۱۵۷

شاہ عباس کے زمانہ میں صفویوں اور یورپ کے تعلقات میں وسعت پیدا ہوئی اور دونوں حکومتوں نے قرآن کے حکم کو قدموں تلے پامال کر دیا جو برابر مسلمانوں کو اجنبیوں مثلاً یہود و نصاریٰ سے دوستی و روابط قائم کرنے سے منع کرتا رہا ہے:

﴿... لا تتخذوا الیھود و النصاریٰ اولیاء ﴾

''یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ

اور مسلمانوں کو باہم اتحاد و دوستی کی دعوت دیتا ہے نیز آپس میں تفرقہ و نزاع کو شدت سے منع فرماتا ہے:

﴿ ولا تنازعوا ... واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا ﴾

خلاصہ یہ کہ دونوں مسلمان حکومتیں ایک دوسرے کی دشمنی میں یورپی اجنبیوں کی دوست ہو گئیں اور ان کے اسلحوں سے برادر کشی پر اتر آئیں۔ اس طرح چار لاکھ چالیس ہزار اور بعض دوسرے اقوال کے مطابق چار لاکھ ستر ہزار افراد اناتولی میں قتل ہو گئے۔ اسی دوران عیسائیوں نے اندلس پر قبضہ کر لیا اور بنی احمر کی حکومت کو سرنگوں کر دیا۔ بنی احمر نے سلطان ترک سلطان سلیم کے باپ سے مدد کی درخواست کی لیکن کوئی مدد نہ پہنچی اور عیسائیوں نے اسپین کے مسلمانوں پر وہ بلائیں نازل کیں اور وہ قتل و غارت کی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ [1]

دوسری طرف ایران اور عثمانی حکومت کے درمیان جنگ و اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان سلیم کے زمانہ میں مذہب شیعہ عملاً عثمانی مملکت میں کالعدم قرار دے دیا گیا۔ [2] نیز اس شیعہ، سنی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۴۰ھ عراق ایرانیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور عثمانی دربار کے علماء نے شیعوں کے قتل کا فتوا دے دیا۔ اس طرح ایران و ترکیہ دونوں حکومتیں جو مشرق کی بڑی طاقتور حکومتیں تھیں کمزور ہو کر زوال کا شکار ہوئیں۔ [3]

یہ کام بالکل عصر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہودیوں کی حرکتوں کی نظیر تھا، جو وہ مدینہ میں انجام دے رہے تھے کہ چند فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور ہر فرقہ دوسرے کے خلاف کسی ایک مشرک قبیلہ مثلاً اوس و خزرج سے ہم پیمان ہوتا، پھر یہ لوگ آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔ [4] کہ قرآن ان کے بارے میں فرماتا ہے:

۱۔ اعیان الشیعہ، محسن امین، ج/۱۱، ذیل شاہ اسماعیل

۲۔ دائرۃ المعارف فارسی (مصاحب) ج/۲/۱۶۸۳

۳۔ الشیعہ فی المیزان، محمد جواد مغنیہ، ص/۱۷۷۔۱۷۸

۴۔ تفسیر التبیان، شیخ طوسی، ج/۱ص/۳۳۶

﴿ ثم انتم هولاء تقتلون انفسكم و تخرجون فريقا منكم من ديارهم تظاهرون عليهم بالاثم والعدوان ... فما جزاء من يفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم القیٰمۃ ﴾ [1]

اتحاد کے لئے سلطنت عثمانی سے نادر شاہ کی کوشش

ایران پر میر محمود افغان کے حملہ اور اصفہان پر ان کے قبضہ کے سات سال بعد نادر شاہ نے انھیں ایران سے باہر کر دیا، اور عثمانی وصفوی حکومتوں کے درمیان شیعہ وسنی اختلافات کے نتیجہ میں دشت مغان میں پیدا ہونے والی زبردست ویرانیوں وتباہیوں کو دیکھ کر اس نے اس شرط پر حکومت قبول کی کہ شاہ طہماسب کی حمایت نہ کرے گا اور خلفاء پر سب ولعن نہ کرے گا۔ اس نے صلح کی ایک کمیٹی تشکیل دی اسے عثمانی سلطان کے پاس روانہ کیا اور اعلان کیا ایرانیوں نے سب ولعن کرنے سے ہاتھ اٹھا لیا ہے، اور تقاضا کیا کہ مذہب جعفری کو اسلامی مذاہب کے پانچویں رکن کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور کعبہ میں وہ رکن شافعی کے ساتھ شریک ہوں۔ نادر شاہ نے شیخ علی اکبر خراسانی کی رہنمائی میں شیعہ وسنی کے درمیان اصولی اختلافات سے انکار کیا اور ان تمام اختلافات کو شاہ اسماعیل صفوی سے منسوب کیا۔

افسوس کہ ان دونوں حکومتوں میں تعصب و بے اعتمادی اس قدر پیدا ہوگئی تھی کہ عثمانیوں نے نادر شاہ کی صرف سیاسی تجویزات منظور کیں اور مذہبی تجویزات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نادر شاہ نے اتحاد کی فضا قائم کرنے کے لئے اپنے بہترین مواقع مال و دولت اور سب سے قیمتی بارہ سال صرف کئے۔ [2]

اسپین سے مسلمانوں کی پسپائی کے ساتھ ہی اسلامی حکومتیں ایک ایک کر کے ختم ہوتی گئیں اور اس کے بعد مغرب نے ہر طرف سے اسلامی ممالک پر حملہ کا آغاز کر دیا۔ آخر کار تمام اسلامی سرزمینوں کی آزادی وعظمت، چاہے وہ شیعہ کی رہی ہوں یا سنی کی، تباہ و برباد ہوگئی اور وہ سب استعمار کے زیر تسلط آ گئے۔ شیعہ وسنی علماء حکومت نے تفرقہ واختلاف کا تلخ مزہ چکھنے کے بعد جب اتحاد کی فکر شروع کی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس بارہ میں امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

۱۔ بقرہ/۸۵

۱۔ سید جمال الدین و وحدت اسلامی، استاد محیط طباطبائی۔ کتاب مشعل اتحاد از استاد محمد رضا حکیمی، ص ۱۰۳۔ و مقدمہ، کتاب اسلام آئین ہمبستگی۔

''عثمانی حکومت ایک اسلامی حکومت تھی جس کا تسلط مشرق سے لے کر مغرب تک تھا ۔انھوں نے دیکھا کہ اتنی قوی حکومت کے روبرو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کے ذخیرے نہیں لے جائے جا سکتے ۔ جب انھوں نے اس جنگ میں اس بساط کے ساتھ (عثمانی وصفوی حکومتوں کے درمیان شیعہ وسنی تفرقہ واختلاف) غلبہ حاصل کرلیا اور عثمانی حکومت کو بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کر دیا اور ہر ایک کے لئے ایک امیر، سلطان یا صدر مقرر کر دیا تو بیچاری قوم ان کے ہاتھوں میں اور وہ استعماریوں کے ہاتھوں میں ۔اس طرح سے انھوں نے اتنی بڑی عثمانی حکومت کو سرنگوں کر دیا۔ اسلامی حکومتیں خواب سے بیدار نہیں ہوئیں یا خود کو سوتا ہوا بنالیا۔عثمانی حکومت اسلامی خلافت کے سایہ میں اور قرآن پر تکیہ کرنے کے دعوے کے ساتھ اتنی وسعت رکھتی تھی ۔ جب اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو اتاترک خبیث کے زمانہ میں اسلام کو وہاں کالعدم کر دیا گیا اور آج وہاں حکومت اسلام سے جدا ہے ۔ دینی مراسم و دینی احکام نہیں ہیں ۔لیکن ترکیہ کی شریف قوم مسلمان ہے، اور جب وہ مکہ جاتے ہیں تو ان کا گروہ دوسروں سے بڑا ہوتا ہے ۔عثمانی حکومت نے اتنی بڑی حکومت اسلام کی بنیاد پر حاصل کی تھی ۔انھوں نے دیکھا کہ اسلام پر تکیہ بہت اہم بات ہے کہ اس کی وجہ سے اسلامی حکومتوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ترکیہ میں اسلام کو حکومت سے جدا کر دیا گیا، وہ بھی اس طرح سے کہ جب قبرس میں ترکوں کو قتل کیا جا رہا تھا تو ایک مسلمان نہیں تھا جو ان پر افسوس کرتا۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ ایک حکومت اس طرح عمل کرے کہ جب وہ عیسائیوں کے مقابل سرنگوں ہو جائے یا جب اس کے افراد قتل ہوں تو دوسرے اسلامی حکومتیں اس سے لا پرواہوں ۔ اسلامی حکومتیں اس لئے افسوس نہیں کر رہی تھیں کہ اس حکومت نے اسلامی عظمت گنوادی تھی ۔

جو ہاتھ شیعہ وسنی میں اختلاف ڈالتے ہیں

امام خمینیؒ مزید فرماتے ہیں:

''تمام اسلامی حکومتیں اس پر توجہ رکھیں کہ جو اختلافات عراق میں ایران میں اور دوسرے ممالک میں کئے جا رہے ہیں ، یہ وہ اختلافات ہیں جو ان کی ہستی کو تباہ

کردیں گے۔

عقل و تدبیر کے ساتھ اس پر توجہ رکھنی چاہئے کہ لوگ مذہب کے نام پر، اسلام کے نام پر اسلام کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ناپاک ہاتھ جو ان ممالک میں شیعہ و سنی کے درمیان اختلاف ڈال رہے ہیں، نہ شیعہ ہیں اور نہ سنی۔ یہ استعمار کے ہاتھ اور ان کے کارندے ہیں۔ وہ (معدنی) ذخائر ان کے ہاتھوں سے چھیننا چاہتے ہیں۔ اور اپنے نام نہاد ترقی یافتہ ممالک کے لئے مشرق میں کالا بازار بنانا چاہتے ہیں۔ وہ مشرق کو اپنی غلامی میں کیوں نہ لائیں (وہ یہ چاہتے ہیں) تا کہ اپنی فضول چیزیں جنھیں وہ دور پھینکنا چاہتے ہیں انھیں مناسب قیمتوں پر ہمارے ہاتھ بیچیں۔ سونا بنائیں اور سونا یہاں سے لے جائیں۔

اسلامی حکومتیں متوجہ نہیں ہیں کہ ان کے سروں پر کیا (مصیبت) آ رہی ہے۔ قرآن کریم سے ہاتھ اٹھانے اور اسلامی دستورات پر بھروسہ نہ کرنے سے یہ نقصان پیش آتے ہیں۔ وہ لوگ مذہبی اختلاف پیدا کر کے اسلامی حکومتوں کو بھی کمزور کرتے ہیں اور دین و مذہب کو بھی تباہ کرتے ہیں''

متحد اسلامی ممالک کا تجزیہ

امام خمینیؒ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''آپ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلامی ممالک کے صدور، حکام، بادشاہان وزراء اور ممبران پارلمنٹ اس بات کو نہ سمجھے ہوں گے؟ اگر سمجھے ہیں تو یا اجنبیوں میں جذب ہوئے ہیں یا ان سے مرعوب ہیں۔ بھلا کیوں ڈریں؟ وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ان لوگوں کو ٹکڑوں ہی میں تقسیم کر دیا ہے۔ اتنی بڑی عثمانی حکومت کو چند حکومتوں میں بانٹ دیا ہے۔ سب چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہیں۔ دس کروڑ کی اس عظیم قوم کو چند خدا سے بے خبر افراد کی غلامی میں دے دیا اور انھیں استعمار کر رہے ہیں۔ (اسلامی) ملکوں کے یہ حکام اپنی قوموں بیچارہ اور بے دست و پا کر رہے ہیں۔ کیا ان اسلامی حکومتوں کو بیدار نہیں ہونا چاہئے؟ انھوں نے اسلام سے کیا برائی دیکھی ہے؟ ایک بڑی سازش ہے جو مغرب

سے نازل ہوئی ہے جس نے اسلامی حکومتوں کو متاثر کیا ہے ۔ یا انھیں لالچ دی ہے یا دھمکی اور اسے ہم اخبارات یا ریڈیو کے پروپیگنڈوں میں دیکھ رہے ہیں'

نسل پرستی مسلمانوں میں تفرقہ کا سبب

وہ اہم چیز جس نے اسلامی حکومتوں کو ناتواں کر دیا ہے اور قرآن کریم کے سایہ سے دور کر رہی ہے نسل پرستی ہے۔

یہ ترکی نسل کا ہے لہٰذا اسے ترکی میں نماز پڑھنی چاہئے ۔ یہ ایرانی نسل کا ہے اس کا الفبا ایسا ہونا چاہئے ۔ وہ عرب نسل کا ہے ۔ عربیت کو حکومت کرنا چاہئے اسلام کو نہیں ۔ آریائی نسل حکومت کرے اسلام نہیں ۔ ترک نسل حکومت کرے اسلام نہیں ۔نسل پرستی بچوں کا کھیل ہے جس میں انھوں (مغربیوں) نے حکومتوں کو مگن کر رکھا ہے۔

جناب آپ ایرانی ہیں ، آپ ترکی ہیں ، آپ انڈونشیائی ہیں اور ۔۔۔ اس نکتہ اعتماد سے غافل کہ سب مسلمان ہیں افسوس کہ یہ نکتہ اعتماد مسلمانوں سے چھین لیا گیا ۔ یہی نسل پرستی جسے اسلام نے قلم زد کر دیا تھا اور سیاہ و سفید، ترک عرب، عجم میں کوئی فرق نہیں رکھا تھا اور صرف تقوا کو معیار قرار دیا تھا۔ ﴿ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم﴾

صرف اسلام تکیہ گاہ ہے ۔ ترک ، فارس ، عرب و عجم کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ نسل پرستی کا قضیہ رجعت پسندی ۔ مسلمان باہم جنگ کیوں کر رہے ہیں؟ یہ اس لئے ہے کہ وہ پرچم اسلام کے زیر سایہ نہیں ہیں ۔[1]

تاریخ کی مختصر ورق گردانی سے ہمیں یہ بات نظر آتی ہے کہ مسلمانوں نے جہاں بھی ترقی کی ہے اس کا راز اتحاد رہا ہے اور جہاں بھی انحطاط و زوال کا شکار ہوئے ہیں اس کا سبب زیادہ تر تفرقہ و پراگندگی ، اسلام سے دوری اور تعصب رہا ہے۔

یہودی اور صلیبی ہمیشہ مسلمانوں کی ترقی سے غصہ ہوئے ہیں ۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے مسلمانوں کے درمیان شگاف اور تعصب کو زیادہ سے زیادہ ہوا دیں اور انھیں ایک دوسرے سے جدا کر کے باہم لڑا دیں ۔

۱۔ امام خمینیؒ ۱۸/۶/۴۳ھ نقل از صحیفہ نور ، ج ۱/ص ۸۶-۹۱

اب جب کہ اسلام ایک بار پھر ایران میں زندہ ہوا ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں ترقی واہمیت پا رہا ہے یورپی یہودی اور عیسائی نیزان کے حکام وحشت زدہ ہو گئے ہیں اور اپنے اسی پرانے نقشہ اور پرانی سازشوں پر عمل کر رہے ہیں اور اختلاف کی آگ بھڑکا کر مسلمانوں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں۔اسی وجہ سے امام خمینیؒ زیادہ تر اپنی تقریروں اور پیغامات میں دنیا کے مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں اور ہر طرح کے تفرقہ واختلاف سے دور رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔

امام خامنہ ای بھی جو ہمیشہ تقریب وہمبستگی کے راہبر رہے ہیں، آپ نے عالمی مجمع تقریب بین المذاہب اسلامی کی بنیاد رکھی اور وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کو تقریب واتحاد کی دعوت دیتے ہیں۔

مردہ یا دماغی موت میں مبتلا انسان

کے عضو کو ہدیہ کیئے جانے کے قانونی آثار

میر سجاد ہاشمی
ترجمہ: سید قلبی حسین رضوی

خلاصہ

مردہ یا دماغی موت میں مبتلا انسان کے اعضائے بدن کو ہدیہ کرنا، مرنے کے بعد انسان کے جسد کے ساتھ معنوی احترام کے حق سے مربوط ہے۔ لیکن چونکہ طبیعی موت کی وجہ سے فوت شدہ افراد کے اعضا سے استفادہ کرنے کی تنہا صورت مرنے کے بعد صرف چند منٹوں کے اندر ہے اور علم طب کے مطابق معمولی حالات میں اس کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں ہے، لہٰذا اطباء اس سلسلہ میں دماغی موت پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، یہ وہ حالت ہے جس میں بدن کے اعضاء صرف ایک قسم کی نباتی حیات رکھتے ہیں۔ بدن کو کنٹرول کرنے والا اصلی مرکز (دماغ) بیکار ہو جاتا ہے اور بدن میں روح کی تدبیر ختم ہو جاتی ہے۔ دماغی موت میں مبتلا انسان کے دوسرے اعضائے بدن سالم ہونے کی وجہ سے، پیوند اعضاء کے بینک کے نام سے مشہور ہیں۔

مردہ انسان کے اعضاء کو ہدیہ کیا جانا، متوفی کی وصیت اور موت سے پہلے اجازت کی صورت میں ممکن ہے، لیکن کسی دوسرے زندہ انسان کی جان کو آخری لمحات میں بچانے کی ضرورت کے فرض پر وصیت نامہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس حالت میں زندہ انسان کی حیات کو بچانا اہم ہے اور وصیت موجود ہونے کی حالت میں بھی، خود انسان کے ارادہ سے امر عقلائی کے مطابق (دوسرے کے بدن میں عضو کا پیوند لگانا)انسان کے جسد کا معنوی احترام ساقط ہو جاتا ہے۔ مذکورہ دو حالتوں کے علاوہ مردہ انسان کے جسد سے تجاوز کرنا کیفری قوانین کی خلاف ورزی ہے۔

مقدمہ

اعضاء کو ہدیہ کرنے اور ان کا پیوند لگانے کی بحث ایسے موضوعات میں سے ہے جن میں علم طب، قانون، ادیان، اجتماعی رسومات کے درمیان علمی ٹکراؤ حتی آسمانی ادیان یعنی عیسائیت، اسلام اور یہودیت کے نظریات اس میں ٹکراؤ اور اختلاف سے پایا جاتا ہے۔ (الفضل، ۱۹۹۰، ص ۷) اعضاء کو ہدیہ کرنے سے مراد، اعضاء کو مختلف قالبوں میں قانونی طور پر منتقل کرنا ہے، جیسے: بیع، ہبہ، وصیّت وغیرہ کہ عضو کو جدا کر کے اسے دوسرے شخص میں منتقل کیا جاتا ہے اور اس طرح اس عضو کی مالکیت دوسرے شخص کو منتقل ہو جاتی ہے اور اس جدا شدہ عضو میں بغیر اجازت دوسروں کا تصرف قانونی آثار، جیسے غصب یا تلف کرنا یا شہری حقوق سے یا کیفری آثار، جیسے: سرقت یا امانت میں خیانت سے دوچار ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔

اعضاء ہدیہ کئے جانے کی بحث میں عضو مہیا کرنے والے ذرائع، اگرچہ نام کے لحاظ سے، حیوانات کے اعضاء، مصنوعی اعضاء، فطری موت سے مرنے والے انسان کے اعضاء، دماغی موت میں مبتلا انسان کے اعضا اور سرانجام زندہ انسانوں کے اعضاء اس میں شامل ہیں لیکن علم طب کے نقطہ نظر سے رکاوٹوں کی موجودگی کے پیش نظر، من جملہ پیوند لگانے والے عضو کا ضروری طور پر زندہ ہونا اور اس کا جنیٹکی لحاظ سے منتقل الیہ کے ساتھ سازگار ہونا ، خاص طور پر عضو مہیا کرنے والے، دماغی موت میں مبتلا انسان ہوتے ہیں جو پیوند اعضاء کے بینک کے نام سے مشہور ہوئے ہیں۔

شیعہ فقہا میں، جو اکثر دماغی موت کو حقیقی موت شمار نہیں کرتے ہیں خصوصیت سے دماغی موت کو قانونی آثار والی موت شمار کرنے کی مخالفت کی کے پیش نظر، خاص طور سے روح کے بدن سے نکلنے کا امر محقق نہ ہونے یا

موت کے عرفی طور پر صادق نہ ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (میرزا جواد تبریزی، ص۵۲۲ کے بعد اور حاج سید علی حسینی سیستانی، ص۵۷) اور ممکن ہے بقائے حیات کا استصحاب بھی مذکورہ نظریہ کی تائید شمار کیا جائے (سید محسن خرازی، ص۸۹) موت کے مفہوم کے سلسلہ میں یہ طرز تفکر کسی حد تک قدیمی اطباء کے نظریہ سے نزدیک ہے کہ اس کے مطابق، دل کی دھڑکن رک جانے، سانس کا سلسلہ بند ہو جانے اور خون کا دوران رک جانے سے موت واقع ہو تی ہے، لیکن قدیمی اطباء کا نظریہ، بعض پیدا ہونے کے بعد کارساز نہیں رہا ہے، کیونکہ مذکورہ موارد میں تجربہ کیا گیا ہے کہ ممکن ہے دل کی موت واقع ہونے سے، انسان دوبارہ زندہ ہو جائے، اگر چہ ایسے موارد کی تعداد کم یا نادر ہو، جبکہ دماغی موت سے دوچار انسان کا دوبارہ زندہ ہونا ناممکن ہے، اور اس حالت میں، بدن کے اعضاء، من جملہ قلب مشین کے ذریعہ ایجاد کئے جانے والے مصنوعی تنفس سے کام کرتا ہے (البارّ، ص۷) اور بعض علمائے اخلاق یا فلسفہ کے تصور کے برخلاف، مصنوعی قلب اسرار و فیوضات الٰہی کا مرکز نہیں ہے، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا، تو قلب کو کسی دوسرے میں پیوند لگانے سے اس کی شخصیت بھی بدل جاتی (اسماعیلی، پائیز۱۳۷۳، ص۲۱۲و۲۱۳)

دماغی موت واقع ہونے کی صورت میں، روح کے بدن پر کنٹرول کرنے کی قابلیت ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ حیات کے بنیادی مراکز، جیسے: مرکز تنفس یعنی قلب اور عصاب کے مراکز دماغ کے بعض حصہ جیسے ''ریشہ'' یا ''ساقہ مغز'' کہتے ہیں اور مرکز تفکر، حافظہ واحساس ''مخ'' میں واقع ہیں (البار، ص۶) اور دماغی موت کی تشخیص، جس طرح ''فوت شدہ یا دماغی موت میں مبتلا افراد کے اعضاء کے پیوند کے قانون'' میں قید ہوا ہے (روز نامہ جمہوری اسلامی ایران شمارہ ۶۹ ۱۱۳ مورخ ۱۳۷۹/۱/۱۷) ماہر ڈاکٹروں کے اختیار میں ہے، کیونکہ وہ نزدیک تریا مطابق واقع اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کا نظریہ ثبوت یا دلیل شمار ہوتا ہے، اس بنا پر عمل کا معیار، اطباء کا خاص عرف ہے، نہ معمولی و عمومی عرف، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مذکورہ ماہر اطباء موثق ہوں۔

ان اوصاف کے پیش نظر، بقائے حیات کے استصحاب کے لئے بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے، کیونکہ **الاصل دلیل حیث لادلیل** (خرازی، ص۸۹) اور صرف ماہر و موثق اطباء کے دماغی موت کے بارے میں شک کرنے کی صورت میں، حفظ حیات کی ضرورت کا قطعی طور پر اہتمام کیا جانا چاہئے۔ اسی لئے ماہر اطباء نے، دماغی موت واقع ہونے کی صورت میں یقین پیدا کرنے کے لئے مدت انتظار کی رعایت کرنے کی تاکید کی ہے۔ اسی لئے مجموعہ (فرد) کے مطابق تین منٹ اور مجموعہ (مینوسوتا) کے مطابق چار منٹ اور مجموعہ ''برطانوی'' کے مطابق مصنوعی سانس رک جانے کے پورے دس منٹ کے بعد موت واقع

ہوجائے گی۔ ۱؎ ''دماغی موت اور اعضاء کا پیوند'' نامی کتاب میں لکھا گیا ہے کہ یہ مدت چھ سے چوبیس گھنٹے تک فرق کرسکتی ہے (وہی مصنف، ص ٦٤)۔ البتہ ماہر اطباء طبیعی تنفس کے دوسرے علائم حیات پر دقت اور تحقیق کر کے دماغی موت کے واقع ہونے کی تائید کرتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ڈاکٹروں کے درمیان ثبوتی لحاظ سے کسی قسم کا اختلاف نظر نہیں ہے، لیکن اثباتی لحاظ سے اختلاف نظر (اگرچہ جزئی) ہے، لیکن اثبات کا مقام دماغی موت کو قبول کرنے میں کوئی خلل ایجاد نہیں کرسکتا ہے۔ اسی طرح بعض شیعہ فقہا نے بھی دماغی موت میں مبتلا شخص کے پھر سے زندہ ہونے کے ناممکن ہونے کے ڈاکٹروں کے عقیدہ پر اعتماد کیا ہے اور مصنوعی تنفس کی مشین کو جدا کرنے یا اس قسم کے مردوں کے عضو کو زندہ شخص کی زندگی بچانے کے لئے دینا جائز قرار دیا ہے۔ (الموسوی خمینی، ۲، ۳۷۔ ص ۹۱، وطباطبائی حکیم، ص ۵۹)

اسلامی کانفرنس کے تابع مجمع فقہ اسلامی رابطہ اسلامی کے مجمع فقہی نے بھی اسی کے مشابہ بیانات اور فیصلے صادر کر کے دماغی موت کو حقیقی موت شمار کیا ہے (فیصلہ نمبر ۵ مجمع فقہ اسلامی تابع اسلامی کانفرنس (بشان اجهزة الانعاش و موت الدماغ) دوردہم، صفر ۱۴۰۸ھ، مکہ مکرمہ)

اہل سنت کے معاصر فقہا کے درمیان اور ان کے فقہی مجامع کے مطابق، اعضاء کو ہدیہ کرنے کی بحث پر موجود نظریات چھ حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں: بعض نے زندہ شخص کے اعضاء کو ہدیہ کرنے اور پیوند کو کلی طور پر منع کیا ہے اور بعض نے (کچھ شرائط کے ساتھ) اسے قبول کیا ہے بعض نے صرف ایک گردے کو دینا جائز قرار دیا ہے اور بعض نے مردہ یا زندہ افراد سے صرف کھال کو منتقل کرنے کو قبول کیا ہے اور آخر کار بعض دوسروں نے مسئلہ کے بارے میں حکم صادر کرنے میں توقف کیا ہے۔ ۲؎

۱۔ 1,paliis c,from brain death to brain stem death br,med ,j1982, 285,adhoc committe of harvard med school a definition of Irreversitle coma,jame,1984,252 677 9

۲۔ من جملہ مخالفین، شیخ عبدالسلام السکری نقل و زرع الاعضاء، ص ۱۳۴ و ۲۱۶، شیخ آدم عبداللّٰه، مجلہ فقه الاسلامی، الدورہ ۴، الجزء الاول، ص ۴۲۵ اور انتقال اعضاء کے معروف موافقین (شیخ جاء الحق، الفقد الاسلامی مرونته وتطوره، ص ۲۔۲۵۳، شیخ یوسف قرضاوی معاصره، ۲۔۵۳۵۔۲/۵۳۳۔۵۳۴ آراستہ مذکور، نقل از ڈاکٹر سمیرہ عاید الدیات، عملیات نقل وزرع الاعضاء البشریہ، ص ۷، ناشر (مکتبة دار الثقا فه للنشر والتوزیع عمّان) طبع اول، ۱۹۹۹ء

اہل سنت کے بعض فقہا کے مطابق ،عضو بدن کو ہدیہ کرنے میں مادی یا عینی معاوضہ حاصل کرنے کے جائز نہ ہونے پر اہل سنت کے فقہا کے درمیان اتفاق نظر ہے اور مخالف نظریہ پر اعتنا نہیں کیا جاتا ہے مجمع فقہ اسلامی تابعہ اسلامی کانفرنس اور مجمع فقہی برائے رابطہ اسلامی نے بھی اعضاء کے منتقل کرنے کو بلاعوض ہونا ضروری سمجھا ہے ۔سعودی عربیہ کے بزرگ علماء کی کمیٹی بھی اس معنی میں زندہ شخص کے سلسلہ میں منتقل کرنے کی تاکید کی ہے ۔مذکورہ مجامع فقہی اور دارالافتا مصر نے بھی زندہ یا مردہ انسان کے اعضاء کو منتقل کرنے کو کچھ شرائط کے تحت ،من جملہ ترجیحی مصلحت یا اضطرار کی شکل عضو کے منتقل کئے جانے ... قبول کیا ہے ۔[۱]

امامیہ فقہا کے درمیان مذکورہ موضوع بحث ونزاع کا مسئلہ بنا ہے ۔بہر حال اکثر معاصر فقہا نے طبیعی موت سے فوت شدہ انسان کے اعضاء کو منتقل کرنا ،فوت ہوئے شخص کی وصیت یا زندہ شخص کی زندگی کو بچانے کی ضرورت کے فرض کی صورت میں جائز ہونا قبول کیا ہے ۔قانون ساز نے بھی ''فوت شدہ یا دماغی موت میں مبتلا بیماروں کے بدن کے اعضاء کا قانون'' پاس ہونے سے پہلے ،اسلامی مجازات کے تدوین شدہ قانون کے کے قالب میں ،انسان کے مرنے کے بعد اس کے جسد کے احترام پر تاکید کی ہے کہ مذکورہ قانون کے مطابق ممکن ہے بدن میت کے احترام کو پامال کرنا تعزیر یا دیہ کا سبب بنے (قانون مجازات اسلامی دفعہ نمبر ۴۹۴)

اس بات کے پیش نظر کہ طبیعی موت سے مرنے والے انسان کے بدن کے اعضاء سے صرف مرنے کے چند منٹ بعد استفادہ کیا جاسکتا ہے ،عام طور پر یہ ممکن نہیں ہوتا ،اس لئے ڈاکٹروں نے دماغی موت کی طرف زیادہ توجہ دی ہے اور دیتے ہیں ۔(حبیبی ،ص ۱۰۹)

جدید طب میں ،طبیعی موت سے مرنے والے افراد کے اعضاء میں صرف آنکھ کے قرنیہ ،جوڑ ،ہاتھ اور پاؤں کی ہڈیاں اور ہاتھ اور پاؤں کی پنڈلیاں ،پیوند کی قابلیت رکھتی ہیں ۔[۲]

۱۔مذکورہ فیصلوں کے سلسلہ میں ملاحظ ہو: فیصلہ مجمع فقہ اسلامی بشان زرع الاعضاء زیر موضوع (انتفاع الانسان باعضاء جسم انسان آخر حیاً ومیتاً) شمارہ فیصلہ (۱) د۴/۸/۸۸اور فیصلہ نمبر (۶/۷/۵۸) بشان استخدام الاجنة مصدراً لزراعة الاعضاء ،جدہ عر بستان ۱۴۱۰ ا ھجری

ب.قرار المجمع الفقهی لرابطة العالم الاسلامی ،القرار الثالث بشان حکم نقل دم و... ۱۴۰۹ ھ مکه مکرمه والقرار الاول "بشان موضوع زراعة الاعضاء "بند ۲،،۱۴۰۵ھ،مکه مکر مه

ج.مضمون قرار هیئة کبار العلماء فی السعو د یه بشان زرع الاعضاء ،(رقم ۹۹ و تاریخ ۱۴۰۲/۱۱/۶ھ

د.الفتویٰ رقم ۱۸۸ الصادره عن مفتی الدیار المصریّه بتاریخ ۱۳ محرم ۱۳۹۴ ،فتوی لجنة الفتویٰ بالا زهر الشریف،منشورة بجدیدة المصری ۹۴/۴/۱۱

۲۔اسی لئے ،قرینہ کے پیوند کے انکشاف کے بعد مردہ افراد کے قرنیہ سے پیوند کے لئے استفادہ کرنے کے لئے خارجی ممالک میں خاص قوانین پاس کئے گئے ہیں (ڈاکٹر حسان الدین الاهوانی،المشاکل القانونیه التی تیثر عملیات زرع الاعضاء البشریة ،ص ۲۶)

اعضاء کو ہدیہ کئے جانے کے سلسلہ میں قانونی لحاظ سے گونا گون مشکلات قابل تصور ہیں۔ان میں سے بعض مشکلات فقہا کی تعبیرات میں اور بعض دوسری خارجی قانون دانوں کی عبارتوں میں پائی جاتی ہیں:

۱۔اعضاء کے لئے وصیت

۲۔اعضاء کا ''ہدیہ'' کے طور پر دینا، خارجی قانون دانوں کی تعبیر میں اور اعضاء سے استفادہ کرنے کا ''اذن''، بعض داخلی یا خارجی فقہا کی تعبیر میں۔

۳۔اعضائے جسد کا معاوضہ حاصل کرنا

ہدیہ کئے جانے کے مذکورہ مشکلات کے ضمن میں قانونی آثار بھی ہیں کہ ہم آگے ان پر بحث وتحقیق کریں گے۔

پہلی بات۔اعضاء کو ہدیہ کئے جانے بحث میں وصیت کی ماہیت اور تاثیر

الف) متوفی کے توسط سے اعضاء کی تملیک

دفعہ نمبر ۸۲۶ ق م کی تعبیر میں تملیک کی وصیت: ''یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے عین مال یا اس کے کسی فائدے کو اپنی موت کے بعد مفت میں کسی کی ملکیت میں قرار دے۔''

بعض شیعہ وسنی علماء کے مطابق، چونکہ انسان کا جسم ایک خاص جوہر کا مالک ہے، اس کے نفس کی کرامت کے پیش نظر، اس کی قدر ومنزلت اور اعتبار کو مادی اشیاء کی حد تک گرانا معقول نہیں ہے (ملاحظہ ہو: علاء الدین بن محمد بن مسعود، جزء ۵، ص ۱۴۰ اور الکمال بن الھام، جزء ۵، ص ۱۸۶۔۱۸۹)، چنانچہ متعارف بھی نہیں ہے اور عرف و عقل بھی اس چیز کو مال کہتی ہے جس کی لین دین اور بازاری قیمت ہو اور ایک آزاد انسان کا وجود خود اس کی ذاتی ملکیت نہیں ہے، بلکہ اس میں دخل وتصرف کا خاص حق خداوند متعال کو ہے، نہ اس سے مربوط شخص کو، کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اس میں دخل وتصرف کرے (آزاد قزوینی، ص ۴۴۔۴۶)، اور اسی طرح، مال نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت نہیں بن سکتا ہے اور عیناً یا منفعت کی صورت میں بھی نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ عرفاً اس پر غصب کا عنوان لاگو نہیں ہوتا ہے اور فقہی مذاہب کے جمہور فقہا کا نظریہ بھی یہی ہے کہ آزاد انسان مال نہیں ہے اور اس کو اغوا کر کے لے جانا چوری محسوب نہیں ہوتا ہے، کیونکہ سرقت کا موضوع اور متعلق بھی مال ہونا چاہئے۔

محقق حلی کی کتاب شرائع میں آیا ہے کہ انسان آزاد کو غصب کرنا قابل ضمانت نہیں ہے اور جواہر الکلام

میں قید کی گئی ہے کہ انسان آزاد کو عیناً یا منفعتاً غصب کرنے کی عدم ضمانت میں کوئی بلا اختلاف (اجماع) ہے (مذکورہ بالا ماخذ) حتی بعض خارجی مما لک کے قوانین میں انسان کے اپنے بدن کے اعضاء اور بدن کی مالکیت کے مخالف، جو اغلب کمیونسٹ، اجتماعی مالکیت کا رجحان رکھنے والے اور فردی ملکیت کے مخالفین ہیں، معتقد ہیں کہ صرف بدن پر تسلط رکھنا، مختلف طریقوں من جملہ وصیت کے ذریعہ جسم واعضائے بدن کی ہدیہ دینے کا جواز پیدا نہیں کرسکتا ہے اور انسان کی کرامت، انسان کے اپنے بدن پر مکمل طور پر تصرف کرنے میں رکاوٹ ہے اور ہم مکمل طور پر مختار نہیں ہیں، بلکہ اپنے اسلاف کی میراث اور ان کے مدیون ہیں اور بدن پر تصرف وتسلط کا بہانہ، انسان کے مرنے کے بعد بے جان جسم کو کسی دوسرے شخص کو ہدیہ کرنے کا جواز پیدا نہیں کرسکتا ہے۔[۱] البتہ یہ اعتراض تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہمارے قوانین میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے اور فقہا وقانون دان، صرف عینی یا اعتباری طور پر تسلط کو ملکیت کے عنوان سے منتقل کرنے کو قانونی وشرعی نہیں جانتے ہیں اور معتقد ہیں کہ اعضاء کے ہدیہ کی قانونی حیثیت کو دوسرے منابع سے درک کرنا چاہئے (محقق داماد، ۱۳۷۶، ص ۱۰۲ و ۱۰۳)، لیکن اعضائے بدن کو ہدیہ کئے جانے سلسلہ میں، جیسا کہ مذکورہ اعتراض میں بیان کیا گیا، بعض اہل سنت فقہا نے، حتی انسان کی کرامت کے معنی بیان کرنے میں وسعت سے کام لیا ہے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ انسان کی تکریم ایک امر واحد ہے اور خداوند متعال نے عام صورت میں انسان کے مجموعی اجزاء واعضاء کو قابل تکریم اور تجاوز سے محفوظ قرار دیا ہے اور عضو یا اعضاء اور اجزائے بدن بھی اس پورے بدن کے ایک حصہ کو تشکیل دیتے ہیں اور جس طرح پورا بدن ہدیہ کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح بدن کے اجزاء میں سے ایک جزو یا اعضاء میں سے ایک عضو ہدیہ کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ (مذکورہ اقوال کی تفصیل کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو: الفصل، ص ۵۲ و ۵۳ اور **سمیرہ عاید الہ یات**، ص ۱۸۵ کے بعد)

حتی بعض اہل سنت فقہا اس حد تک آگے بڑھے ہیں اور کہا ہے: انسان کے بدن کے اعضاء اصل (عدم مالکیت) کے لحاظ سے تمام فقہا کی نظر میں مال نہیں ہیں اور مال کی خصوصیت کے عنوان سے ان میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے، لیکن حنفی فقہ میں انسان کا جسم، اموال کی حیثیت سے اس، کی ملکیت شمار کیا گیا ہے (مذکورہ اقوال کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: **التصرف القانو نی فی الاعضاء البشریہ، مذکورہ مولف، ص ۵۲ و ۶۰ سمیرہ عاید الدیات، مذکورہ)**

۱۔ h a m j ten have and j v m eds own ership of the human body 4 1998 kluwer academic publishers۵

وصیت کے باب میں، انسان کے بدن کے اعضاء کو مال کی حیثیت سے قبول کرنے کے فرض اور وصیت کے ذریعہ اعضاء کی مالکیت اور قانونی تصرف کو قبول کرنے کے باوجود ممکن ہے وصیت کے خصوصی قواعد کے لحاظ سے ایک اور اعتراض پیش آئے اور وہ یہ کہ اعضاء کی وصیت، معدوم چیز کی وصیت کی قسم ہے اور مالکیت کو ایک عدم امر پر قائم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ (کاتوزیان، ص ۲۸۵)

مذکورہ اعتراضات مندرجہ ذیل صورت میں قابل جواب ہیں: اول یہ کہ انسان کے اپنے اعضاء کے بارے میں مالک نہ ہونے کا خیال، مسلّم قانونی اساس نہیں رکھتا ہے، کیونکہ ایک چیز کی ملکیت کے لئے جو چیز ضروری ہے، وہ تصرف اور اس کا مخصوص حق ہے اور ان اشیاء (بدن کے ذریعہ پیدا ہونے والی اجزاء مثلاً خون...) اور بدن کے اعضاء کی مالکیت کے بارہ میں انسان کے ذہن کے نامأنوس ہونے کے باوجود اور اس کے بدن کے اعضاء، کم سابقہ ہونے کی وجہ سے یہ مالکیت واضح ترین مالکیت کے مصادیق میں سے ہے حتی اس کے قانونی مفہوم میں ہے کہ حقیقت میں یہ مالکیت ذاتی اور طبیعی ہے۔ فقہانے ان اشیاء کے بارے میں عقد صلح کے اعتبار کو قبول کیا ہے، اگر چہ بعض نے ان کی بیع کے بارے میں شک کا اظہار کیا ہے۔ (شہیدی، ص ۳۹۴ اور مزید: نجفی، ج ۸، ص ۱۷۵)

دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے انسان کی کرامت کے مفہوم کی وسعت کے پیش نظر اس کے اعضاء کی مالیت کا اس کے کل بدن کے مانند، صرف ایک قیاس کے ذریعہ انکار کیا ہے انہوں نے اس پر توجہ نہیں کی ہے کہ جس طرح ہم نے اس سے پہلے کئی بار اشارہ کیا کہ مال ہونا، نسبی مفہوم ہے اور اگر گزشتہ زمانوں میں علمی ترقی نہ ہونے کے باعث، اعضاء کا پیوند ممکن نہ ہونے کی وجہ سے، وصیت کے قالب میں مردہ انسان کے بدن کے اعضاء ہدیہ کیا جانا اس کے معقول و مشروع تصور نہ ہونے کے سبب سے ممکن نہیں تھا، لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ، اس حالت میں متوفی کی وصیت کی صورت میں، متوفی کے جسم کا احترام اور کرامت کو پامال کرنا اور بے احترامی یا مثلہ کرنا لاگو نہیں ہوتا ہے (مشابہ استدلال کا مشاہدہ کرنے کے لئے ملاحظہ ہو الفتویٰ نمبر ۱۸۸، **الصادرة عن مفتی دار الافتاء المصریه** بتاریخ ۱۳، محرم ۱۳۹۴ء) کیونکہ متوفی نے خود نے عقلائی لحاظ سے پیوند اعضاء کے نام پر، عضو کے ضرورتمند افراد کی مدد کی غرض سے، اپنے جسد کے احترام کو مورد نظر عضو وفراہم کرنے کے بقدر ساقط کر دیا ہے اور یہ اسقاط حق معنوی اگر بعض معین اعضاء تک محدود ہو، تو اسقاط حق کا مصداق جزئی طور پر تھا اور لازم الاجرا ہے (شہری قانون کے دفعہ نمبر ۹۵۹ اور ۹۶۰ کا مفہوم) اصالۃ الاباحہ، کے علاوہ دلیل مخالف کا فقدان بھی اس اسقاط حق کے جائز ہونے کی تائید کرتا ہے۔ فقہانے بھی اسقاط حق کے صحیح ہونے کو جزئی طور پر قبول کیا ہے (تائید کے لئے ملاحظہ ہو: نائینی

،ج ۲،ص۱۰۵) لیکن اعضاء کے موجود نہ ہونے اوران کے مال ہونے کے فقدان کے بارے میں اعتراض، ظاہراً وصیت کے دوران صحیح ہے، لیکن جاننا چاہئے کہ ان امور کے بارے میں وصیت جو وصیت جاری کرنے کے دوران فاقد ماہیت وجودی (ہماری بحث میں عرفی) ہیں، لیکن بعض لوگوں کی تعبیر میں ان کی ایجاد میں عقلائی احتمال (ملاحظہ ہو: خوئی، ص۳۰۲ جو متوقع الوجود کی تعبیر میں وسعت کا رجحان رکھتے ہیں، اس کے علاوہ ملاحظہ ہو: طباطبائی حکیم، ص۳۶۸) اور یا بعض دوسروں کی تعبیر میں مستقبل میں ان کا انجام پانا صحیح ہے۔

شہری قانون کی دفعہ نمبر۸۴۲ بھی اس سلسلہ میں کہتی ہے: ''ممکن ہے جو مال ابھی وجود میں نہ آیا ہو اس کی وصیت کی جائے۔'' اور مورد وصیت عضو یا اعضاء، وصیت کے نفاذ کے وقت میت کے بدن سے جدا ہونے کے بعد مال شمار ہوتے ہیں اور عقل و عرف کے مطابق ان کی سرقت اور غصب قابل ضمانت ہے، اور ان کا ہدیہ کیا جانا جائز ہے۔

ب۔ موت کے بعد اعضاء کو ہدیہ دیئے جانے کا وعدہ اور اعتراضات

وصی کی جگہ پر کسی شخص کو معین کر کے ہدایتی وصیت کی صورت میں اعضاء کو ہدیہ کرنا ممکن ہے، تاکہ فوت شدہ موصی کے قابل استفادہ اعضاء سے ضرورتمند اشخاص کی جان بچانے کے لئے استفادہ کیا جائے۔ قابل ذکر ہے کہ ایسی وصیتوں میں اغلب وصیت کا براہ راست صاحب نفع معین نہیں ہوتا ہے اور صرف ہسپتال یا کوئی خاص ادارہ وصیت کو نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ اس حالت میں (وصی کا تعیّن اور موصی لہ کا عدم تعیّن) ممکن ہے یہ اعتراض وارد کرے کہ عرفاً اعضاء میں سے ایک عضو کی وصیت کے برخلاف، انسان کے پورے جسد کو مال شمار کرنا اور اس کی وصیت کرنا مشکل نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ بعض لوگوں نے انسان کے بے جان بدن کے اختیار کو حق اللہ کا مصداق شمار کیا ہے اور اس قسم کی وصیتوں کو بالکل قابل مسترد قرار دیا ہے، کیونکہ ان کی نظر میں بے جان انسان کے بدن کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا، اس پر ذاتی حق نہ ہونے کی وجہ سے اس کے انفرادی اختیار سے خارج ہے (آزاد قزوینی، مذکورہ حوالہ اور مزید ملاحظہ ہو: فقیہی، ص۶۸)

ث۔ موت کے بعد اعضاء کو ہدیہ کئے جانے پر اعتراض کا جواب

مذکورہ اعتراضات کے برخلاف، قانون بنانے والے انسان کے بے جان بدن کے لئے جو احترام مد نظر رکھا ہے، وہ ذاتی حق معنوی ہے جو غیر مالی حقوق میں سے شمار ہوتا ہے، نہ کہ خداوند متعال سے مخصوص کوئی حق۔

ہاں ان حقوق کا حقیقی اختصاص و اختیار بھی خدا سے متعلق ہے۔لیکن یہ امر خدا کی مالکیت کے طول میں انسان کی فطری مالکیت کے منافی نہیں ہے اور اپنے ہم نوعوں کی جان بچانے کے لئے اعضاء کے ہدیہ کئے جانے کا اختیار اعضا کی وصیت کے قالب میں حکمی قوانین نہ ہونے کی وجہ سے نافذ ہے اور یہ حق اگرچہ شخص پر قائم ہونے کی خصوصیت کے سبب قابل انتقال نہیں ہے، پیوند اعضاء کے سلسلہ میں استفادہ کرنے کے لئے، اس انفرادی معنوی حق کا دوسروں کے مقابل میں اسقاط، اگر بعض معین اعضاء، مثال کے طور پر قرینہ، دل، جگر وغیرہ تک محدود ہو، جیسا کہ فقہا کے ایک گروہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے، تو شرعی طور پر جائز اور معقول ہے۔(خوئی، مسئلہ ۳۹، ص ۴۲۶)

ج۔میت کے اعضاء کے انتقال کے سلسلہ میں جدید فقہائے اہل سنّت کا نظریہ

مقالہ کے مقدمہ میں ذکر کئے گئے اہل سنت کے فقہا کے متعدد اقوال کو صرف نظر کرتے ہوئے، اہل سنت فقہاء کے نظریات دو کلی گروہوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں:

ا۔اہل سنت کے بعض فقہا عضو کو دوسرے کے بدن میں پیوند لگانے کے لئے میت سے لینا، مطلقاً منع جا نتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ سورہ عبس کی آیت نمبر ۲۱ کے مطابق دفن کرنے کا وجوب واضح اور میت کے بدن سے کوئی عضو جدا کرنا، اس کے جسد کے کسی عضو کو دفن نہ کرنے برابر ہے اور یہ امر ممنوع ہے(شیخ آدم عبداللہ، جزء اول، ص ۴۲۵)

اس کے علاوہ پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کی گئی روایت کے مطابق میت کی ہڈی کو توڑنا (عظم) زندہ انسان کی ہڈی توڑنے کے برابر ہے اور حتی اعضاء کے بارے میں متوفیٰ کی وصیت پر عمل کرنا، متوفی کے اپنے اعضاء کا وصیت کے دوران مالک نہ ہونے کے سبب، ممنوع ہے۔اس کے علاوہ، مثلہ کرنے سے اجتناب کو ممنوعیت کی ایک اور دلیل سمجھا جاتا ہے۔(السکری، ص/۲۱۶)

۲۔دوسرے گروہ نے میت کے اعضاء کو ہدیہ کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کو بعض شرائط کے ساتھ قبول کیا ہے۔بعض نے میت یا اس کے ولی کی اجازت شرط رکھی ہے، اور بعض نے اس امر کو ضروری نہیں جانا ہے، کیونکہ اس گروہ کے ظاہری فتویٰ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترجیحی مصلحت اور درپیش ضرورت کو جواز کے لئے کافی جانتے ہیں۔بعض دوسروں نے بھی ترجیحی مصلحت یا درپیش ضرورت کے پیش نظر صاحب حق سے اجازت لینے کی شرط پر اسے جائز جانا ہے۔یہ گروہ ولی میت کے فقدان کی صورت میں درپیش ضرورت اور زندہ انسان کی زندگی

بچانے کی ترجیحی مصلحت کے پیش نظر یا کسی زندہ انسان کے عضو کی زندگی بچانے کو میت کے جسد کے احترام کی مصلحت پر مقدم جانتا ہے، اور اسے قانونی طور سے جائز ہونے کو قبول کرتا ہے (ملاحظہ ہو: فضیلة الشیخ حسن مامون ،شوال ۱۳۷۸ ش ،ص ۱۹۳ اور ملاحظہ ھو :فضیلة الشیخ محمد خاطر ،رقم ۱۰۶۹ ،س ۱۰۵ ،م ۳۰۶۷۳ ذی الحجہ ۱۳۹۲)۔ لیکن شیخ جاد الحق ، نے میت سے عضو لینے کو عضو کے منقول الیہ میں استفادہ کے ممکن ہونے کے سلسلہ میں ڈاکٹر کے ظن غالب کی شرط رکھی ہے (جاد الحق ،ص ۲۵۲)۔ لیکن ایک دوسرے موضوع میں، فائدہ اور عضو کو ہدیہ کئے جانے پر بحث کے علاوہ، بعض قواعد کو مدنظر رکھ کر، جیسے: (الضرورات تبیح لمحظورات والضرر الا شدیزال بالضرر الا خف) میت سے ضرورتمند شخص کی زندگی کو بچانے کے لئے فائدہ کے رجحان کے تحت میت سے عضو لینا جائز جانا ہے۔ (مقل شیخ جاد الحق علی جاد الحق، رجب ۱۴۰۶ ق ،العدد ۷، ۸ تشرین الاول)

میّت کے اعضاء کو منتقل کرنے کے بارے میں فقہی مجامع کا نظریہ

دار الافتاء مصر نے اپنے فتویٰ نمبر ۱۸۸ میں، شیخ مامون اور شیخ محمد خاطر کے مانند، شیخ جاد الحق کے فتویٰ کے مشابہ، رجحان مصلحت اور اس کے احترام میت پر تقدم ہونے کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے درپیش ضرورت کے لحاظ سے، میت سے عضو جدا کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس حالت میں، پیش کئے گئے استدلال کے مطابق، یہ عمل احترام میت کو پامال کرنا یا کرامت انسان کی بے احترامی، شمار نہیں ہوتا ہے (الفتویٰ رقم ۱۸۸ ،الصادرہ عن مفتی الدریار المصریہ بتاریخ ۱۳ محرم ۱۳۹۴ ق ،فتوی لجنة الفتویٰ بالازھرا لشریف المنشورہ بجریدةالمصری، بتاریخ ۱۱/۴/۱۹۹۴ ء)

سعودی عرب کے بزرگ علماء کی کمیٹی نے بھی مصری فقہا کی پیروی میں، میت کے کسی عضو کو یا اعضا میں سے کسی حصہ کو کسی دوسرے مسلمان میں منتقل کرنے کو دوسرے شخص کے مضطر ہونے، اور عضو کو جدا کرنے میں کسی دشواری کے نہ ہونے اور منتقل الیہ کے بدن میں عضو کے کامیاب پیوند کے غالب ظن کی شرط رکھی ہے۔ (موضوع: مضمون قرار ھیئة کبار العلماء فی السعودیہ بشان زرع الاعضاء ، رقم ۹۹ ،۶/۱۱/۱۴۰۲ ق)

رابطہ عالم اسلام کے فقہی مجمع نے بھی عضو کے لئے مضطر انسان کی جان بچانے کے لئے میت سے عضو لینا جائز جانا ہے بشرطیکہ جس شخص کا عضو منتقل کیا جائے وہ مکلّف ہو اور اس نے اپنی زندگی میں اس کی اجازت دی ہو ، کیونکہ مذکورہ مجمع کی نظر میں جب زندہ شخص سے عضو حاصل کرنا جائز ہے تو مردہ سے عضو لینا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا

(قـرار الـمجمع الفقهى لرابطة العالم الاسلامى ،القرار الاول بشان موضوع ذراعة الاعضاء ،دورـة الثـانية ۷ جمادى الاولى ۱۴۰۵ ق،مندرج فى مجلة الفقهى العدد الاوّل ۱۴۰۸،ص ۲۴ . ۳۹) اما مذکورہ فقہی مجمع کے ایک سابقہ فیصلہ، جو اس نے انتقال خون کے سلسلہ میں صادر کیا ہے اور اسی فیصلہ کے تیسرے حصہ میں لفظ ''متبرع'' سے تاکید کی ہے، سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کے اعضاء کو منتقل کرنے کا تنہا طریقہ رضا کارانہ طور پر اعضاء کو ہدیہ کرنا ہے، کیونکہ خون کو معاوضہ کے طور پر منتقل کرنے کو آیہ شریفہ: ﴿انـمـا حرّم عـليكم الميتة والدّم ...﴾ اور روایت ''انّ الـلّـه تـعالىٰ اذ حرم شيئاً حرم ثمنه '' سے استناد کیا ہے اور مذکورہ پہلے حکم سے عدول کو طبّی مقاصد کی ضرورت کی صورت کے بغیر جائز نہیں جانا ہے (الـمـجـمـع الفقهى لرا بطة العالم الاسلامی،القرار الثالث بشان حكم نقل الدم... وهل يجور اخذ العرض عن هذا الدم اولا ،دورة الحادية عشرة المنعقده بمكة المكر مه ۱۳ رجب ۱۴۰۹ ق)

اسلامی کانفرنس کے تابع مجمع فقہی نے اپنے چھٹے بند میں شرعی لحاظ سے کسی میت کے عضو کو زندہ انسان میں منتقل کرنے کو منتقل الیہ کی زندگی کے لئے ضروری ہونے یا اس کی سلامتی عضو کے پیوند پر منحصر ہونے کی شرط پر جائز قرار دیا ہے لیکن اس کے لئے میت یا اس کے ولی کی اجازت کی شرط رکھی ہے۔

اس مجمع کی نظر میں، عضو رضا کارانہ طور پر منتقل کیا جانا چاہئے اور عضو کو انسان کی قدر و منزلت کو کم کرنے کے لئے بیچنا ممنوع ہے، لیکن مطلوبہ عضو کو حاصل کرنے کے لئے مال کو بخشنا یا انعام و تکریم کے طور پر دینا قابل بحث و نظر ہے۔ (قـرار مـجـمع الفقهى الاسلامى بشان زرع الاعضاء قرار رقم (۱) ۸۸/۸/۴ . ۸۸ بشان انتـفـا ع الانسـان باعضاء جسم آخر حياً او ميتياً المنعقده فى الدورة مو تمره الرابع بجدة فى مملكة العربية السعودية ،ص ۱۸ . ۲۳ جمادى الاخرة ۱۴۰۸ ق)

دوسری بات: حفظ حیات کی ضرورت کے لئے وصیت کی محدودیت یا عدم محدودیت

بعض معاصر فقہا کی ظاہری رائے کے مطابق صرف اس صورت میں اس قسم کی وصیت (عضو کو جدا کرنے اور پیوند لگانے) پر عمل کرنا جائز ہے کہ ایک مسلمان کی جان کو بچانا ایسی وصیت پر منحصر ہو۔ (فاضل لنکرانی، ص ۲۰۲، اور مکارم شیرازی، ص ۲۰۹)

اس امر کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ ضرورت پیدا ہونے کی صورت میں، وصیت کے وجود اور عدم وجود کے در

میان کوئی فرق نہیں ہے اور زندہ مسلمان کی زندگی کو بچانے کی اہمیت کے پیش نظر، میت کے حق معنوی میں مداخلت کی مشروعیت کی توجیہ ہو جاتی ہے[٦]

کیونکہ مذکورہ معنوی حق کی حفاظت زندہ انسان کی حیات کی حفاظت کے مقابل میں کمتر اہمیت رکھتی ہے اور ہمارے زمانہ میں متوقع ضرورتوں کی بہتات اور ان کا وجود میں آنا دوا اور ان کی ضرورت کے مانند ہے، بلکہ اس کی ضرورت اعضاء کی ضرورت کو پورا کرنے والے منابع کی محدودیت کے پیش نظر، رائج کی ضرورت کی نسبت زیادہ ہے۔ اس بناپر وصیت اور اعضا کو رضا کارانہ طور پر دینے میں کوئی مشکل نہیں ہے کہ یہ کام عام طور پر استعمال سے قبل پیوند اعضاء کے بینک میں انجام پاتا ہے، کیونکہ اطمینان کی صورت میں اور بعض عقلائی احتمالات کی تعبیر میں اس امر کی ضرورت کا تحقق شرعی اور جائز شمار کیا جائے گا (ملاحظہ ہو: فقہی، ص ٦٠-٦٤)، خاص کر بعض شیعہ فقہا نے ظاہری حکم سے، اعضاء کو جدا کرنے کے جواز کو قبول کیا ہے اور بالفعل ضرورت کی بناء پر کسی قسم کی قید و شرط کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: خوئی، منیة المسائل، ص ٢١٠، ٢١١)

قانون پیوند اعضاء کی دفعہ نمبر (١) میں، پیوند اعضاء کے سلسلہ میں آمادہ ہسپتالوں کو وزارت صحت سے اجازت حاصل کرنے کے بعد اس کی اجازت دی گئی ہے ''بیمار کی وصیت یا میت کے ولی کی اجازت سے وہ متوفٰی کے بدن کے اعضاء سے استفادہ کر سکتے ہیں۔'' (ملاحظہ ہو روزنامہ رسمی ١٣٧٩/١/١٧ ش ١١٣٦٩)

ہلالین (iin verted comas) کے درمیان قرار پانے والی مذکورہ بالا قید، قانون ساز کے ایسے افراد کے نظریہ کی پیروی کا شائبہ دیتی ہے، جو اعضاء کے استفادہ کو متوفّٰی کی وصیت کے باوجود زندہ انسان کی حیات کو بچانے کی ضرورت پر منحصر جانتے ہیں اور آخری گروہ کے نظریہ کے مطابق صرف زندہ انسان کی حیات کو بچانے کی ضرورت کی صورت میں میت کے احترام میں مداخلت کی توجیہ کی جاسکتی ہے نہ کہ کسی عضو کو بچانے کے لئے کسی زندہ انسان کے عضو، کو لینے کی، جیسے: گردے یا آنکھ۔

٦۔ سید محمد سعید طباطبائی حکیم، بحوث فقیہ (١) فقہ الاستنساخ البشری، سوال ١٠، ص ٣٥۔ اس محترم فقیہ نے صرف زندہ انسان کی زندگی کو بچانے ضرورت کی حالت میں میت یا دماغی موت میں مبتلا شخص سے عضو لینے کو جائز قرار دیا ہے اور اس حالت میں وصیت کا ہونا یا نہ ہونا ان کی نظر میں حکم کے جواز پر کوئی اثر نہیں ڈالتا ہے۔

جواب میں کہا جاسکتا ہے: بیان میں کسی قسم کی تاخیر موجود نہیں ہے اور قانون گزار نے شائع اور یقینی صورت کو مثال کے طور پر، نہ کہ قید کی صورت میں ذکر کیا ہے اور اس کی وصیت اور عمل دونوں مفروضوں میں صحیح ہے اور قانونی لحاظ سے بھی موصی کے اپنے بدن پر حق معنوی اور احترام ذاتی ہونے کے پیش نظر اور ایک دوسرے تجزیہ کے مطابق وصیت کے صحیح ہونے اور اس پر عمل کی تائید کی گئی ہے۔

تیسری بات۔

الف۔اہل سنت اور مجامع فقہی کی نظر میں ولی میت کی موافقت کی ضرورت

اس موضوع کے سلسلہ میں اہل سنت فقہا اور مجامع فقہی کی آراء میں اختلاف ہے:

۱)۔بعض اہل سنت فقہانے، میت کے اعضاء کو ہدیہ دیے جانے کے سلسلہ میں، میت یا اس کے وارثوں کی (اس فرض میں کہ پہلے سے اجازت نہ ہو) یا حاکم کی اجازت کی (شخص لاوارث کے بارے میں) شرط رکھی ہے (القرضاوی، ج۲،ص ۵۳۵۔۵۳۷) اور ملاحظہ ہو: بکر ابی عبداللہ ابوزید،ص ۲۶۳)

۲)۔بعض دوسرے سنّی فقہاء نے میت کے اعضاء کو ہدیہ دینے کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق اس کے وارثوں یا حاکم کو دیا ہے (رمضان البوطی ،العدد۴ ،الجزء الاول ،ص ۲۱۲) فقہا کے اسی گروہ سے بعض افراد نے میت کے اعضاء سے استفادہ کرنے کے بارے میں قانونی جواز کو متوفّی کے لاوارث ہونے کی صورت میں، ترجیحی مصلحت اور عدم تعدّی کی صورت میں، قانونی جواز کی شرط رکھی ہے۔(حسن مامون مذکورہ حوالہ اور ملاحظہ ہو: فتوای شیخ خاطر سلخ جلد المیت ... مذکورہ حوالہ)

۳)۔لیکن فقہا کے ایک دوسرے گروہ من جملہ شیخ جاد الحق نے، منقول الیہ کے عضو کی قابلیت اور اس کے امکان کی صورت میں ڈاکٹر ظن غالب کو میت کے اعضاء سے استفادہ کرنے کے جواز سے مستند قرار دیا ہے۔(جاد الحق،ص ۲۵۲)

یہی سنی فقیہ، مجلّہ ''اللواء الاسلامی'' میں شائع ہوئے ایک مقالہ میں مذکورہ نظریہ کے علاوہ ضرر کو دور کرنے کے لئے قاعدہ ضرورت وتقدم کے سلسلہ میں زیادہ تر فقہا کے نظریات بیان کرتا ہے اور سرانجام میت کے عضو لینے کے فائدے اور زندہ انسان کے عضو کی ضرورت کے رجحان کو جواز کی سند قرار دیتا ہے اور عملی طور پر اپنے گزشتہ معیار کو محدود کرتا ہے بغیر اس کے کہ وہ ولی میت کی موافقت یا میت کی اجازت کو کوئی اعتبار کردے (ملاحظہ ہو: جاد الحق علی جاد الحق ،۹ رجب ۱۴۰۶ ق ،مجلد المحاماة العدد ۸۰۷ تشرين الاول

،تشرین الثانی،مقال بعنوان:الشرجعه الاسلامیه و نقل الاعضاء انسان الخ)

مذکورہ مختلف نظریات میں، اسلامی کانفرنس کے تابع مجمع فقہ اسلامی نے پہلے گروہ کے نظریہ کی پیروی کی ہے اور میت یا مرنے کے بعد اس کے وارثوں کی اجازت، یا (مجہول الحیثیت یا لاوارث افراد کے بارے میں)مسلمانوں کے ولی کی اجازت کی شرط رکھی ہے۔ملاحظہ ہو:قرار مجمع الفقه الاسلامی بشان زرع الاعضاء رقم د ۸/۴. ۸۸/ ۱۴۰۸ق فی الجده العربية السعوديه)

۲)۔ جبکہ رابطہ عالم اسلامی کے مجمع فقہی نے عضو کے لئے مضطر اور حاجتمند انسان کی جان بچانے کے لئے میت سے عضو لینے کو اس صورت میں جائز قرار دیا ہے کہ ناقل عضو مکلّف ہو اور اس امر کے سلسلہ میں اس نے اپنی زندگی میں اجازت دی ہو (ملاحظہ ہو:قرار الاول بشان موضوع ذراعة الاعضاء،مذکوره بالارقم)

۳) دارالافتاء مصر نے انسان کی تکریم اور اس کے جسد کے احترام کی اہمیت کو بیان کرکے، میت سے عضو لینے کو صرف درپیش ضرورت کے مطابق ترجیحی مصلحت، جیسے زندہ انسان کی جان بچانے کی ضرورت یا اس کے اعضاء میں سے کسی عضو مانند آنکھ کے قرینہ کو بچانے کی ضرورت، کے پیش نظر جائز جانا ہے۔اس طرح مذکورہ مرجع کے فتویٰ سے بظاہر استفادہ ہوتا ہے، کہ مذکورہ شرائط حاصل ہونے کی صورت میں وارثوں، حاکم کی قبل از مرگ اجازت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ چنانچہ شیخ جادالحق کے فتویٰ سے بھی بظاہر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔(دار الافتاء مصری فتوی کے لئے ملاحظہ ہو: الفتویٰ رقم ۱۸۸ الصادره عن مفتی الديار المصريه به تاريخ ۱۳ محرم ۱۳۹۴ق فتوی الفتوی لجنة بالازهر الشریف منشور بجريدة المصريه به تاريخ ۱۱ / ۴ / ۱۹۹۴)

۴)۔ لیکن سعودی عربیہ کے بزرگ علماء کی کمیٹی نے میت کے اعضاء کو زندہ مسلمان میں منتقل کرنے کو دوسرے شخص کے اضطرار، ناقل سے عضو لینے میں فتنہ پیدا نہ ہونے اور منتقل الیہ میں عضو کا پیوند کامیاب ہونے کے احتمال کا غلبہ کے شرائط رکھے ہیں اور متوفیٰ کے، وارثوں یا حاکم سے اجازت لینے کی طرف براہ راست کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، اگرچہ عدم فتنہ کی شرط کم از کم بعض موقع پر پسماندگان کی خوشنودی حاصل کرنے کی ضرورت کو ایجاد کرسکتی ہے۔(مذکورہ فتوی کے لئے ملاحظہ ہو:مضمون قرار ھیئۃ کبار علماء فی السعودیہ، بشان زرع الاعضاء رقم ۹۹ بتاریخ ۶/۱۱/۱۴۰۲ق)

ب۔ایران کے داخلی قانون میں اعضاء کو منتقل کرنے کے سلسلہ میں ولی میت کی اجازت

کی ضرورت یا عدم ضرورت

وصیت کے فقدان کی صورت میں فوت شدہ بیماروں کے اعضاء کے پیوند سے مربوط قانون کی دفعہ ایک کے مطابق، فوت شدہ انسان کے سالم اعضاء کو ضرورتمند بیماروں میں پیوند لگانے کے لئے میت کے ولی کی اجازت ضروری ہے۔

یہ مقولہ مذکورہ دفعہ کے ظاہر سے واضح ہوتا ہے، کیونکہ مذکورہ دفعہ اختیاری صورت میں وصیت کی شرط کو مقدم کرنے اور اس کے بعد ولی کی شرط کو لانے اور رابطے کے حرف ''یا'' کو ان دو کے درمیان قرار دینے سے بظاہر مذکورہ مقولہ کی تاکید ہوتی ہے۔

اس وقت مطلب کو واضح کرنے کے لئے ہم سرسری طور پر ولی کی ولایت کے مفہوم پر نظر ڈالتے ہیں۔ ولایت، عام معنی میں ایک ایسا تسلط ہے، جسے کوئی شخص دوسرے کے مال و جان پر حاصل کرتا ہے۔ صاحب **بلغة الفقیه** اسے سلطنتی جانتے ہیں کہ جو عقلاً یا شرعاً دوسرے کے مال یا جان یا دونوں پر اصلی یا عارضی صورت میں ثابت ہے (ملاحظہ ہو: آل بحرالعلوم ج ۳، ص ۲۱۰)

عبادی مسائل کے سلسلہ میں روایتوں میں آیا ہے کہ میت کو اولویت کے لحاظ سے اس کے نزدیک ترین افراد غسل دیتے ہیں یا وہ غسل دیتا ہے جیسے میت کا ولی غسل دینے کا دستور دیدے۔

فوجداری قوانین کے مسائل کے میں سورہ اسراء کی چھٹی آیت کے مطابق ﴿**من قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیّه سلطاناً**﴾

حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہے: ''**ولی الدم یفعل مایشاء ان شاء قتل وان شاء صالح**

(ملاحظہ ہو: خرازی، ش ۲۱، ص ۲۸)

اسی بنا پر اسلام کے جزائی قانون نے قصاص یا دیت لینے میں ولی دم کے اختیار کو قبول کیا ہے اور جزائی قانون کی دفعہ نمبر ۲۶۱ میں مقرر کیا گیا ہے کہ اولیائے دم ہی مقتول کے وارث ہیں، جنھیں قصاص لینے یا عفو کرنے کا اختیار ہے۔ البتہ شوہر یا بیوی قصاص، عفو اور دیت کی درخواست کرنے کا اختیار نہیں رکھتے ہیں۔

خاندانی روابط میں ولایت، وہ اقتدار ہے جسے قانون ساز نے بچہ یا بے عقل یا دیوانہ کے مالی اور تربیتی امور کو چلانے کے لئے، جن کی حفاظت کا زمانہ بچپن کے زمانہ سے متصل ہے، اس کے باپ اور دادا کو سونپا ہے۔ ملاحظہ ہو: صفائی و امامی، ج ۲، ص ۱۶۰ و ص ۱۶۴ اور ملاحظہ ہو: کاتوزیان ج ۲، ض ۲۰۲) (دفعہ نمبر ۱۱۸۳ ق م)۔ ممکن

ہے یہ دعویٰ کیا جائے کہ لفظ ولی کے مفہوم کا اقتضا یہ ہو کہ میت کے امور کی ذمہ داری ولی کی مصلحت کے مطابق ہے اوراس کے نتیجہ میں اگر ولی میت کے اعضاء کو دوسرے شخص میں پیوند لگانے کے لئے مصلحت جانے تو وہ اس قسم کی اجازت دے سکتا ہے، لیکن اگر مذکورہ ادلہ کی بناء پر ولایت کے بارے میں غور کریں، تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اگر چہ مذکورہ امور میں اصل ولایت استثنائی طور پر اور مصلحت کی بنا پر نیز اصل عدم ولایت کے برخلاف اجتماعی امور کے سلسلہ میں جائز قرار دی گئی ہے، لیکن ولایت کی عمومیت اور ولایت کے اطلاق کو ولایت کے مذکورہ استثنائی امور میں جائز ہونا کسی صورت میں حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے اور احترام میت کے عام طور پر لازم ہونے سے دستبردار ہونا ممکن نہیں ہے۔ لیکن قانون ساز نے اسلامی کانفرنس کے تابع مجمع فقہ اسلامی کی پیروی میں متوفی کے بدن سے عضو کو مہیا کرنے کے لئے وصیت یا ولی کی موافقت (وصیت کے نہ ہونے کی صورت میں) کی شرط رکھی ہے (ملاحظہ ہو: **قرار مجمع فقه اسلامی (بشان زرع الاعضاء)** مذکورہ حولہ) جبکہ ہم نے اس سے پہلے کئی بار ثابت کیا ہے کہ میت کا معنوی حق اور احترام ایک خصوصی حق ہے اور میت پر قائم ہے اور اس کو معدود صورت میں ساقط کرنے کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت متوفی کے بدن کے بعض معین اعضاء سے مخصوص اور متوفی کی زندگی سے مربوط ہے اور دوسرے جیسے میت کے رشتہ دار حتی ولی میت، کہ بظاہر قانون ساز کی ولی میت سے مراد اس کے وارث ہیں، مذکورہ حق کو ساقط کرنے کا اختیار نہیں رکھتے ہیں اور اگر میت کو دفن کرتے وقت اور اس کے مرنے کے بعد عملاً کوئی ضرورت پیش آئے، جیسے کسی دوسرے انسان کی زندگی کو بچانا میت کے عضو پر منحصر ہو، تو اس حالت میں **قاعدہ الاھم فالمھم** کے مطابق (یعنی احترام میت کے مقابلہ میں زندہ انسان کی حیات کو بچانے کی زیادہ اہمیت) اگر چہ کوئی وصیت بھی نہ ہو تو حتی میت کے ولی اور رشتہ داروں کی موافقت کے بغیر بھی مذکورہ عضو کو متوفی کے بدن سے جدا کیا جا سکتا ہے۔

یہ استدلال اور نظریہ جو قریب بہ اتفاق ہے حتی معاصر شیعہ فقہاء کا اس پر اجماع ہے (ملاحظہ ہو: ضمیمہ استفتاآت کتاب دماغی موت و پیوند اعضاء، مذکورہ مؤلف، ص ۸۱ کے بعد اور ملاحظہ ہو: توضیح المسائل دوسرے فقہائے عظام، جیسے حاج شیخ حسین وحید خراسانی، احکام تشریح، مسئلہ ۲۸۹۴ اور سید علی سیستانی، **منہاج الصالحین**، ج ۱، **مسائل متحدثه**، مسئلہ ۵۸ اور سید سعید طباطبائی حکیم، مذکورہ) اصول و قواعد اور باب ولایت کے ادلہ کے مطابق ہے، ساتھ ہی ساتھ عملی مصلحتوں سے بھی اس کی حمایت ہوتی ہے، کیونکہ میڈیکل سائنس کی ترقی کے پیش نظر متوفی کے بدن کے عضو سے فوری اسفادہ کرنے کی ضرورت اس وجہ سے کہ موت کے بعد بدن کے اعضاء فوری طور پر خراب ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف زندہ اعضاء فوری رشد کرتے ہیں اور اعضاء کو اعضاء کے بینک میں محفوظ رکھنا

نا قابل برداشت خرچ کا سبب بنتا ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ: اس ہنگامی اور غم و غصہ کی حالت میں ایک طرف پیش آنے والی فوری ضرورت اور دوسری طرف اعضاء کے فوری خراب ہونے کے پیش نظر فقہ امامیہ میں متفق نظریہ کی موجودگی میں اور اصول و قواعد کی پیروی کرتے ہوئے میت کے ولی سے اجازت لینے کو قانون سے حذف کیا جانا چاہئے، اور قانون کو نافذ کرنے کے مشکلات کو تبلیغات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اور روزناموں اور لوگوں کی آگاہی کی سطح میں تبدیلی پیدا کر کے لوگوں کی فکر و پریشانیوں کو دور کیا جانا چاہئے، نہ یہ کہ ولی کی موافقت کی قید کو پاس کر کے اصول و قواعد حتی مصلحت کے خلاف ایک طریقہ اختیار کیا جائے۔

اس امر کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اس قسم کا قانون مذہبی لوگوں پر لاگو ہوتا ہے اور مسئلہ کی صحیح تبلیغ اور لوگوں کو عدم ضرورت کے اسباب کے بارے میں آگاہ کرنا ان کی موافقت کو حاصل کرنا حساسیتوں میں کمی لا سکتا ہے اور قانون کو نافذ کرنے کا ماحول فراہم کر سکتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ میت کے رشتہ داروں کی موافقت حاصل کرنے کا طریقہ ایک ایسا طریقہ ہے جو دوسرے ممالک کے قوانین میں بھی مطلوب نتائج نہیں دے سکا ہے، اور مذکورہ مشکلات، نے بعض ممالک کے قانون دانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ فرضی رشتہ داروں کی موافقت کا دامن پکڑیں، اس طرح میت کے بدن کے اعضاء سے فوری طور پر استفادہ کرنے کی ضرورت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ڈاکٹر میت کے رشتہ داروں سے اجازت اور موافقت حاصل کرنے تک ضروری اعضاء کو میت سے جدا کرنے کا اقدام کر سکے۔ اس نظریہ کے مطابق اصل یہ ہے کہ رشتہ داروں کی موافقت موجود ہے، مگر یہ کہ اس کے برعکس ثابت ہو جائے یا متوفی نے موت سے پہلے یا اس کے رشتہ داروں نے اس کے مرنے کے بعد اس امر میں اعتراض کیا ہو۔[1]

اس نظریہ کے طرفداروں نے، اعضاء کے فوری طور پر خراب ہونے کی علمی مصلحت اور رشتہ داروں کے اعتراض سے روبرو نہ ہونے کی مصلحت کے درمیان ایک درمیانی طریقہ کا انتخاب کر کے اس قسم کا نظریہ قائم کرنے میں پہل کی ہے۔ ساتھ ہی، جس طرح اس سے قبل بحث ہوئی، اسلامی کانفرنس کے تابع مجمع فقہ اسلامی نے بھی میت سے عضو لینے کو میت کی یا اس کے ولی کی اجازت کی شرط رکھی ہے۔ بظاہر قانون ساز نے بھی مذکورہ قانون کو پاس کر

,griese 0 ,organ iransplant, is presumed cansent the answer ,partl how serious is the ـ ۱ shortaje ethics and medics g y 2,3 june 1984 and partll is the cost beyond the reach of needy 9 b 2,4 july 1984 and partlll 9 8 2,4ag 1984,

نے میں مجمع فقہ اسلامی کے فیصلہ کی پیروی کی ہے، جبکہ رابطہ عالم اسلامی کے مجمع فقہی کا فیصلہ اصول و مصلحتوں کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور بیشتر مطابقت رکھتا ہے، کیونکہ مذکورہ فیصلہ کے دوسرے حصہ کے پہلے پیراگراف میں عضو کے لئے ضرورتمند انسان کی جان بچانے کے لئے میت کے عضو کو حاصل کرنا، میت کی قبل از مرگ اجازت پر منحصر کیا گیا ہے، لیکن مذکورہ فیصلہ اس لحاظ سے قابل اعتراض ہے کہ اس نے حتی دوسرے انسان کی جان بچانے کی ضرورت کے باوجود بھی میت سے قبل ازموت اجازت کو ضروری جانا ہے، جبکہ قواعد ''**الضرورات تبیح المحظورات** ''اور ''**الاهم فالمهم**'' کے پیش نظر میت کی اجازت کی شرط بے دلیل ہے۔(ملاحظہ ہو: **قرار مجمع فقه اسلامی بشان زرع الاعضاء،مذکوره شماره اور قرار مجمع فقهی رابطه عالم اسلامی ،بشان زراعة الاعضاء** ،مذکورہ شمارہ)

جیسا کہ بیان ہوا ، ہمارے ملک (ایران) کے قانون کے مطابق اور فقہ امامیہ کے نظریہ کے مطابق اور فوت شدہ بیماروں کے پیوند اعضاء کے قانون کے برخلاف انسان کا اپنے ولی یا وارثوں کے ساتھ رابطہ، ایک خونی رابطہ ہے، نہ کہ مالی رابطہ، کیونکہ انسان کے اموال کا موضوع وراثت ہے نہ کہ اس کے ابدان اور انسان کے احترام کا حق ، غیر مالی حق کی صورت میں پسماندگان کو منتقل نہیں ہوتا ہے اور وہ میت اور متوفی کے اعضاء کو دوسروں میں منتقل کرنے کے سلسلہ میں فیصلہ کرنے کے باب میں کوئی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں اور ضرورت کے مقام پر اجازت حاصل کرنے اور وارثوں کی موافقت حاصل کئے بغیر دوسرے کی زندگی کو بچانے کے لئے میت کے اعضاء سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور میت کے ولی کی موافقت کو حاصل کرنا مذکورہ استدلال کے علاوہ بیان شدہ مصلحت کے پیش نظر ضروری نہیں ہے، البتہ قابل ذکر بات ہے کہ متوفیٰ کی وصیت کے بغیر ضرورت کے موقع پر ایک ایسے عضو کی حفاظت کے لئے جس سے زندہ انسان کی حیات وابستہ نہیں ہے، استفادہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن ضرورت کے موقع پر زندہ انسان کی زندگی کی حفاظت کے لئے متوفیٰ کا اپنی زندگی میں یا اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثا کا اعتراض بھی کوئی فائدہ نہیں دیتا، کیونکہ وہ میت کے بے جان جسد پر کوئی حق نہیں رکھتے ہیں اور اس جسد کے مال نہ ہونے کی وجہ سے ان کے نفاذ یا عدم نفاذ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ فوجداری کے قوانین کے مطابق مردہ پر ظلم کی دیت

فلاحی کاموں میں خرچ ہوتی ہے اور متوفیٰ کا ترکہ اور پسماندگان کی میراث شمار نہیں ہوتی ہے، البتہ فلاحی کاموں پر مقدم متوفی کا قرض ہے، یعنی اگر متوفیٰ مقروض ہو تو پہلے اس کا قرضہ ادا کیا جائے گا (تبصرہ دفعہ ۴۹۴ قانون مجازات اسلامی)

چوتھی بات۔ جسد انسان کے حق احترام کا دوسرے انسان کی حیات سے موازنہ پر ایک تفصیلی بحث

متوفیٰ انسان کے جسد کے حق احترام، زندہ انسان کی حیات کو بچانے کے موازنہ میں مختلف مکاتب فکر میں گونا گون اختلافات اور اظہار نظر پائے جاتے ہیں۔ شافعی اور بعض حنفی، میت کا گوشت کھانا اور مردہ معصوم بچہ (بظاہر جو میت قابل احترام ہوتی ہے یا وہ مردہ جس کا گوشت کھانا ممنوع ہے) کو کھانا ضرورت کی حالت میں جائز جانتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کے امر کے جائز ہونے کی دلیل کے طور پر حسب ذیل اشارہ کیا گیا ہے:

''لان حرمة الحی اعظم من حرمة المیت'' زندہ کا احترام مردہ کے احترام سے بلند تر ہے۔'' اہل سنت کے بعض فقہا اور قانون دانوں نے، عرب ممالک میں، اسی نظریہ سے متاثر ہو کر یا مفہوم ضرورت کی وسعت کے پیش نظر زندہ انسان کے احترام کی حفاظت کی مصلحت کے پیش نظر حتی ایسے موارد میں بھی جہاں مردہ انسان کا عضو، زندہ انسان کی حیات کے لئے ضروری بھی نہ ہو لیکن اس کے اعضاء میں سے ایک عضو کو بچانے کے لئے ضروری ہو، جیسے انسان کی نابینائی کا علاج کرنے کے لئے مردہ انسان کی آنکھ کی پتلی کا پیوند لگانا، ایسی حالت میں مردہ انسان کے عضو کو حاصل کرنے کو شرعی و قانونی قرار دیا گیا ہے اور حتی وصیت نہ ہونے کی صورت میں بھی اسے ضروری سمجھا گیا ہے (الفیروز آبادی، ج ۱ ص ۱۳۴ و ۲۵۷ و ۲۵۸۔) بعض شیعہ فقہا نے بھی، کسی زندہ انسان کے اہم عضو کو بچانے کے لئے، جیسے آنکھ کے لئے، میت کے عضو کو کاٹنے کا حتی وصیت کے نہ ہونے کی صورت میں بھی حکم دیا ہے (ملاحظہ ہو: مکارم شیرازی، رسالہ توضیح المسائل، مسئلہ ۲۴۴۴) دار الافتاء مصر نے بھی اسی نظریہ کی تائید کی ہے، اور اسلامی کانفرنس کے تابع مجمع فقہ اسلامی نے بھی مذکورہ نظریہ کے مشابہ روش کو اپنایا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ولیء میت کی موافقت بھی شرط رکھی ہے۔ سعودی عرب کے بزرگ علماء کی کمیٹی نے بھی بظاہر زندہ مسلمانوں

کے اضطرار کومیت کا عضو حاصل کرنے کے لئے کافی ووافی شرط جانا ہے،اس شرط پر کہ عضو کو کاٹنے سے کوئی فتنہ نہ پیدااور پیوند کا عمل بھی کامیاب ہو(ملاحظہ ہو:مفتی الدیار المصریه ، فتوی رقم ۱۸۸،مذکورہ منبع بشان زرع الاعضاء ، رقم ۹۹،بتاریخ ۱۱۶/۱۴۰۲ اق اور ملاحظہ ہو:قرار مجمع فقه الاسلامی ، مذکورہ شمارہ،ساتواں پیراگراف من حیث احکام الشر عید و ملاحظہ کے لئے فتوی مقارن نظریہ مذکورہ مجمع،ملاحظہ ہو فتاویٰ شیخ محمد خاطر و شیخ مأ مون،مذکورہ شمارہ)

مذکورہ نظریہ کے مقابلہ میں،بعض (فقہا) کی آراء بالکل اس کے برعکس ہیں۔متوفیٰ انسانوں سے عضو لینے اور منتقل کرنے کی بحث میں ضرورت کے مفہوم کواس قدر محدود کرنے کے قائل ہوئے ہیں کہ،پوسٹ مارٹم کی قطعی حرمت اور مثلہ کے عدم جواز سے استناد کرتے ہوئے،زندہ انسان کی جان بچانے کے لئے میت کے اعضاء کو قطع کرنے کی مخالفت کی ہے،کیونکہ ان کی نظر میں احکام واقعی مصلحتوں کے تابع ہیں نہ کہ ایجاد شدہ مصلحتوں کے!

انہوں نے امر بین ارتکاب حرام کے دوران،یعنی زندہ انسان کی جان بچانے کے لئے مردہ انسان کے بدن سے عضو کو جدا کرنے کے سلسلہ میں اہم کے مہم پر مقدم ہونے کے قاعدہ کو قبول نہیں کیا ہے اور اسے صحیح شرعی مبنا نہیں جانا ہے اور سرانجام یہ کہ مومن میت کے احترام کو زندہ انسان کے احترام سے زیادہ قرار دیا ہے(ملاحظہ ہو: آزاد قزوینی،ص۶۰۔۶۸)

معاصر شیعہ علماء کے معتبر نظریہ کے مطابق،فوت شدہ انسان کا احترام زندہ انسان کے احترام سے نہ کم تر اور نہ زیادہ ہے،بلکہ اس میں فوت شدہ انسان کے احترام کو زندہ انسان کے احترام کے مانند تشبیہ دی گئی ہے(لان حرمته میتاً لحرمته وهو حی)(حر عاملی) وسائل الشیعه ،ج۲۹،ابواب دیات الاعضاء ،ب۲۴،ح۴)۔اہل سنت فقہاء جیسے:بیہقی اور ابن ماجہ نے بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ میت کی ہڈی (عظم) کو توڑنا،زندہ انسان کی ہڈی توڑنے کے مانند ہے(بیہقی،ج۴،ص۵۸ کتاب الجنائز وسنن ابن ماجہ ،ج۱،ص۵۱۶ کتاب الجنائز،حدیث نمبر ۱۶۱۷)۔اسی ترتیب سے اس کے بے جان جسد کو مثلہ کرنا ممنوع قرار دیا ہے(ایاکم والمثله ولو بالقلب العقور) (حاج سید علی نقی فیض الاسلام،نہج البلاغہ(ترجمہ

وشرح) نامہ ۴۷ ، ص ۹۷۸ ، ابن ملجم کی ضربت کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی امام حسنؑ وامام حسینؑ کے نام سفارش) اوراس کے دفن کو واجب اورانسان کے جسد کے دفن میں تاخیر کو مذکورہ احترام کے تقاضا کے تحت ممنوع قرار دیا ہے۔(اذا مات المیت فخذ فی جھازہ وعجلہ) (حر عاملی، وسائل الشیعہ، ج۲،استحباب تجھیز باب ۴۷ ،ح۶)

مذکورہ احادیث اور روایتوں کے پیش نظر اور مشہور نظریہ کی پیروی کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ: جس راستہ پر شافعی اور بعض اہل سنت اور ان کی پیروی میں عرب ممالک کے بعض قانون دانوں اور فقہا نے مفہوم ضرورت اور زندہ انسان کے احترام کو مردہ کے احترام پر ترجیح دینا قبول کیا ہے، بے جان انسان کے بدن کے احترام کے فطری حق سے چشم پوشی کی ہے اور حتی جہاں پر ایک عضو کی زندگی مثل آنکھ کی پتلی کے بچانے کی مصلحت موجود ہے، عملاً بے جان آدمی کے جسد کے احترام کو ساقط جانتے ہیں۔شافعی اور بعض حنفیوں کی طرف سے پیش کی گئی تحلیل کی پیروی کرنا اس امر کا سبب بن جاتا ہے کہ ہم عنوان اولیہ کے طور پر صرف عقلائی مصلحت کے بناء پر فوت شدہ انسان سے عضو لینا،حتی وصیت نہ ہونے کی صورت میں بھی جائز جان لیں،جبکہ اہم کے مہم پر مقدم ہونے کا قاعدہ،مردہ انسان کے عضو کے حصول زندہ انسان کی جان بچانے کے سلسلہ میں ثانوی حالت رکھتا ہے حتی فقہا اس صورت میں مردہ پر ظلم کرنے کی دیت کے واجب ہونے کے منکر نہیں ہوئے ہیں (سید روح اللہ الموسوی الخمینی ،رسالہ توضیح المسائل ،مسئلہ ۲۸۸۲)،اوراعضائے میت سے استفادہ کرنے کا جواز ثانوی ہونے کی وجہ سے ،عضو کو دوسرے منابع سے حاصل کرنے کی صورت میں ،احترام میت کو توڑنے کے جواز کا حکم بھی منتفی ہوجاتا ہے (الضرورت تقدر بقدرھا) اور یہاں تک کہنا چاہئے کہ اگر عضو کا حصول دوسرے منابع ،جیسے حیوانات سے یا زندہ انسان سے اس کی مرضی کے مطابق ممکن ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ بنیادی طور پر ضرورت کا وجود ہی ثابت نہیں ہے کہ جائز ہونے کے حکم اس پر صادر کیا جائے۔

بعض افراد کے برعکس جو بے جان انسان کے جسد کا احترام زندہ انسان کے احترام سے بالاتر جانتے ہیں،پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان کی جان بچانے کے لئے عضو کی بحث میں ،عقلی قاعدہ ضرورت اہم کے مہم پر مقدم ہونے کو اغلب فقہانے قابل عمل قاعدہ کے طور پر اور قانون دانوں نے بدیہی اور بلامناقشہ قاعدہ کے طور پر قبول کیا ہے

کہ جس کے لئے استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ متوفیٰ انسان کے اعضاء سے زندگی بچانے کے لئے استفادہ کی ضرورت کے باب میں حقیقی مصلحتوں کے فقدان کا دعویٰ صرف دعویٰ اوراس کی کائی دلیل نہیں ہےاورحتی حقیقی مصلحت کا حفظ حیات کے نام سے موجود ہونا بھی، جس پر دنیا کے عقلا قطعی منبا کے طور سے تاکید کرتے ہیں، مذکورہ ادعا کے برعکس تقاضا کرتا ہے۔

تیسرے یہ کہ میت کے احترام کا زندہ انسان کے احترام سے زیادہ ہونا، موجود روایتوں کے نص اوران کے ظاہر کے خلاف ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں موجود روایات اوراحادیث مساوی احترام پر دلالت کرتی ہیں اورحتی مثلہ کے بارے میں موجود روایتیں اور جلدی دفن کرنے کے وجوب اور دفن میں تاخیر کے حرام ہونے کی دلیل بھی مذکورہ دعویٰ کو ثابت نہیں کرسکتی ہے۔ کیونکہ مذکورہ استدلال، عادی اور غالب مواقع پر ناظر ہیں اورحکم اولیہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں اورانسان کی زندگی کو بچانے کی ضرورت جیسے استثنائی موارد سے جدا ہیں کہ باب ضرورت کے قواعد کی عناوین اولیہ پرحکمرانی اس امر کی تاکید کرتی ہے۔اس کے علاوہ وفات کے بعد،منع ضرر جسمی کے قاعدہ اور انسانوں کے ایک دوسرے پرعدم ترجیح کے بارے میں استناد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مثلہ اورتاخیر دفن کے حرام ہونے سے متعلقہ باب کی روایات بھی، زندہ انسان کی حفاظت کی ضرورت کے قاعدہ یاوصیت کے قالب میں احترام میت کے ساقط ہونے کے تحت قابل توجیہ ہیں۔

یہ نظرآتا ہے کہ بعض افراد کے تصور کے برخلاف (مخالف رائے کودیکھنے کے لئے ملاحظہ ہو: شیخ علی آزاد قزوینی، مذکورہ حوالہ) مذکورہ روایتوں کی میت کی ھتک حرمت کومنع کرنے والی احادیث کی روشنی میں معنی کرنا چاہئے، اس مفہوم میں کہ میت کی بےحرمتی کی ممنوعیت کی علت اورمیت کومثلہ کرنے اوردفن میں تاخیر کی ممنوعیت ،انسان کے مرنے کے بعداس کے بےجان جسد کے احترام معنوی کی بےحرمتی سے اجتناب ہے کہ احادیث میں معتدل صورت میں اسے زندہ انسان کے بدن کے احترام سے تشبیہ دیا گیا ہے۔لیکن بعض مواقع پرکہ انسان محدود صورت میں، مذکورہ معنوی حق کے اسقاط کے ساتھ بعض معین اعضاء کے بارے میں ایک عقلائی محرک کے لئے پیوند اعضا کے نام سے اورعضو کےمحتاج افراد کے اضطرار کودور کرنے کے لئے شارع کی طرف سے مورد حمایت حق

احترام کی مخالفت کرتا ہے، یہ ایک خود ساختہ اور قواعد کے غیر منافی اقدام ہے اور فقہی تعبیر کے مطابق احکام کے غیر منافی اقدام ہے کہ اس کی دلیل احسان وایثار کے عظیم عقلائی منافع کی ممنوعیت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس قسم کی قہری دست برداری کا نتیجہ، خود شخص کے ذریعہ حق سے دست برداری ہے اور اس دلیل کی بناء پر کہ مذکورہ ممنوعیت جسد میت کے احترام پر قائم ہے، مذکورہ احترام کی دست برداری اور خود شخص کی مرضی کے مطابق، ممنوعیت اپنے مبنا کو کھو دیتی ہے اور ایسی حالت میں بے بنیاد حکم کی پیروی نہیں کی جاسکتی ہے۔

نتیجہ

جدید میڈیکل سائنس کے نظریہ کے مطابق عادی موت سے مرنے والے افراد کے اعضاء میں سے صرف آنکھ کی پتلی، جوڑ اور ہڈیاں پیوند کی قابلیت رکھتے ہیں۔ عضو مہیا کرنے کا خاص منبع دماغی موت سے دوچار انسان ہیں جو پیوند اعضاء کے بینک کے نام سے مشہور ہیں اور سپیشلسٹ ڈاکٹروں اور قانون سازوں نے اس حالت کو موت واقع ہو جانے کی حالت کے طور پر قبول کیا ہے، لیکن فقہا کے درمیان دماغی موت پر اتفاق نظر نہیں ہے۔

ایک زندہ مسلمان کی جان کو بچانے کی ضرورت کے مواقع کے علاوہ، فوت شدہ شخص کے اعضاء سے استفادہ کرنا متوفیٰ کی وصیت کی صورت میں بھی ممکن ہے، اس شرط پر کہ متوفیٰ کی طرف سے اس کی عضو کو دوسرے زندہ مسلمان کے بدن میں پیوند لگانے کی اجازت ہو اور جسد کے احترام سے تضاد بھی نہ رکھتا ہو۔ اسی لئے یہ کام بعض مخصوص اعضاء، جیسے قلب اور جگر وغیرہ تک محدود ہونا چاہئے۔

منابع ومآخذ:

۱. آزاد قزوینی ،شیخ علی،مسائل مستحدثه ،چاپ مطبعه سیّد الشهداء ،قم ۱۴۱۶ ق

۲. آل بحر العلوم ،سیّد محمّد،بلغةالفقهیه، ج۳،منشورات مکتبة الصادق ،تهران ،چهارم ۱۴۰۳ ق

۳.ابن ماجه، کتاب الجنائز و سنن ، ج ۱ ،دار احیاء الکتب العر بیه ،ام دار الفکر العربی

،۱۳۵۳ ق
۴. اسـناعیلی ،اسماعیل ،مجلّه فقه (فقہ اسلامی میں ایک نئی تحقیق)مطبع دفتر تبلیغات اسلامی،ش اول ،پایز ۱۳۷۳.
۵. الاهوانی ،حسام الدین ،المشاکل القانو نیه التی تثیر عملیات زرع الاعضاء البشریه ،مکتبة عین شمس ،۱۹۷۵م.
۶. البارّ محمد علی ،اجهزة الانعاش ،مجمع الفقه الاسلامی ،غیر منشور.
۷. السکری ،شیخ عبدالسلام ،نقل وزرع الاعضاء.
۸. السکری ،شیخ عبدالسلام ،نقل وزرع الاعضاء ،من منظورإسلامی ،دار المنار ،القاهرة ،الطبعة الاولی ،۱۹۸۸م.
۹. الفضل ،منذر،التصرف القانو نی فی الاعضاء البشریه ،اول ،۱۹۹۰ ،بغداد.
۱۰. فیروز آبادی ،ابراهیم بن علی ،المهذب ،ج ۱ ،دار احیاء الکتب العر بیّه قاهره .
۱۱. القر ضاوی ،شیخ یوسف ،فتاویمعاصره ،دار الوفاء،المنصورة ،۱۴۱۳ ق
۱۲. المفتی،الشیخ حسن مامون ،الموضوع نقل عیون الموتی الی الاحیاء المبادی ،رقم ۱۰۸۷ ص ۱۹۳ ،شوال ۱۳۷۸ق.
۱۳. المفتی ،الشیخ محمّد خاطر ،الموضوع سلخ جلد لعلاج حروق الاحیاء المبادی ،رقم ۱۰۶۹ ،س ۱۰۵ م۳،۶۷۳ذو الحجّة
۱۳۹۲ق.
۱۴. الموسوی الخمینی ،سید روح الله،رساله توضیح المسائل ،مطبع علمیّه قم.
۱۵. مجله طبّ وتزکیه ،ش ۸۰،تابستان ۱۳۷۲.
۱۶. الموسوی الخویی ،سید ابو لقاسم ،منهاج الصالحین ،معاملات وعبادات ،مستحد ثات

المسائل ،احکام التر قیع ،مطبعه مهر قم،۱۴۱۰ق.

۱۷. بیهقی ،سنن کبری ،ج۴ ،مطبعة مجلس دائرة المعارف العنما نیه ،حیدر آباد الد کن ،الهند.

۱۸. تبریزی ،میرزا جواد ،صراط النجاة فی اجوبة الاستنفتائات .،مطبعة دار الاعتصام ،قم (بی تا).

۱۹. حبیبی ،حسین،مرگ مغزی و پیوند اعضا، انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی پژوهشکده فقه و حقوق.

۲۰. حرّ عاملی ،وسا ئل الشیعه ،ج۲و ۲۹ ،مطبع مهر قم.

۲۱. حسینی سیستانی ،سید علی، منهاج الصالحین ،ج ۱ ،مستحد ثات المسائل ،احکام التر قیع،مطبعه مهرقم ،۱۴۱۴.

۲۲. خرازی ،سید محسن ،مجلّه فقه اهل البیت،ش ۱۹ ،مؤسسه دائرت اکمعارف اسلامی ،۱۴۲۲ق.

۲۳. دار الافتاء مصر،الفتوی رقم ۱۸۸ الصادره عن مفتی الدیار المصریه بتاریخ ۱۳ محرم ۱۳۹۴ ق،فتوی الفتوی لجنةبالازهر الشریف منشوربجریدة المصریه به تاریخ ۱۹۹۴/۴/۱۱.

۲۴. روز نامه رسمی جمهوری اسلامی ایران ،ش ۱۳۶۹۱ ،۱۳۷۹/۱/۱۷

۲۵. شهیدی ،مهدی ،تشکیل قرار دادها و تعهدات ،نشر حقو قدان ،جلد اول ،۱۳۷۷ق.

۲۶. شیخ جا د الحق ،الفقه الاسلامی ،مرونته و تطوره.

۲۷. صفایی ،سیّد حسن وا مامی ،اسدالله،حقوق خانواده ،ج۲(قرابت ،نسبو آثارآن)،انتشارات دانشگاه تهران ،۱۳۷۶ش.

۲۸. طباطبای حکیم، سید محمّدسعید، احکام الفقهیه (عبادات و معاملات)، بی نا، دوم، ۱۴۱۸ق.

۲۹. بحوث فقهیه (۱) فقه استنساخ بشری و فتاوی طبی، بی نا، اول، ۱۴۲۰ق.

۳۰. عاید الدیات، سمیره، عملیات نقل وزرع الاعضاء البشریّه، مکتبة دار الثقافة للنشر والتوزیع عمّان، اوّل، ۱۹۹۹ء.

۳۱. عبدالله، شیخ آدم، مجله فقه الاسلامی، الدوره ۴، الجزء الاول.

۳۲. علاء الدین بن محمّد بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، مطبعة الامام زکریا علی یوسف، قاهره، ۱۹۱۰ء

۳۳. فقیهی، عبدالرحمن، مجموعة مقالات مستحدثه پزشکی، پیوند اعضاء، ج۱، بیع اعضا الانسانی، مرکز تحقیقات فقهی قوه قضائیه، تابستان ۱۳۷۷ه ش.

۳۴. فیض الاسلام، سیّد علی نقی، نهج البلاغه (ترجمه وشرح) مطبع احمدی، انتشارات فقیه، بهار ۱۳۷۷ه ش

۳۵. قانون مجازات اسلامی جمهوری اسلامی ایران، مصوب ۱۳۷۰ه ش.

۳۶. قرار، شماره ۹۹، هیئة کبار العلماء فی السعودیّه بشان زرع الاعضاء، تاریخ ۱۴۰۲/۱۱/۶ق.

۳۷. قرار های المجمع الفقهی لرابطة العالم الاسلامی، شماره اول بشان موضوع زراعة الاعضاء ودوم بشان اجهزة الانعاش و موت الدماغ و سوم بشان حکم نقل الدم.

۳۸. قرار های مجمع فقه الاسلامی شماره ۱ بشان زرع الاعضاء و شماره ۵ بشان اجهزة الانعاش و شماره ۶ بشان استخدام الاجنة مصدرا لزراعة الاعضاء به ترتیب منتشره در مجلّه مجمع فقه الاسلامی (عدد۴، ۳، ۶)

۳۹.کاتو زیان ،ناصر ،عقود معین (۳):عطایا ،هبه ،وقف ،وصیت ،مطبع بهمن ،۱۳۷۸ه ش

۴۰.محقق داماد،سیّد مصطفی ،قواعد فقه بخشی مدنی (۲)سمت،۱۳۷۶ش.

۴۱.مقال شیخ جاد الحق علی جاد الحق ،جریده اللواء الاسلامی رجب ۱۴۰۶ق.مجله المحاماة،العدد ۷،۸تشرین الاول.

۴۲.نائینی ،مرحوم میرزا محمّد حسین غروی ،منیةالطالب ،ج۲.

۴۳.نجفی ،شیخ محمّد حسن ،جواهر الکلام ،ج۸،دار احیاء التراث ،بیروت ،۱۴۱۲ق.

۴۴.وحید خراسانی ،شیخ حسین ،توضیح المسائل ،احکام تشریح ،مدرسه باقر العلوم ،۱۳۷۹ش.

45. H.A.M.J ten have and J.V.M(eds), ownership of the human body, (4), 1998 KLuwer Acadamic publishers.

46. from Brain to Brain stem death Br.med. J 1982, 285, Adhoc committe of harvard med school APaliis c Definition of Irreversitle coma. jame, 1984, 252: 677-9

اسلام کے فقہی مذاہب، مشکلات فقر کے مقابل

محمد اسماعیل توسلی (کارشناس ارشد اقتصاد اور محقق دانشگاہ مفید)
ترجمہ: سید شاہد حسین رضوی

خلاصہ:

اسلام کے پانچوں مذاہب زکات کے واجب ہونے پر متفق القول ہیں، مگر کن چیزوں اور کن لوگوں پر زکات واجب ہے اس سلسلہ میں ان کے نظریات مختلف ہیں اور نظریہ کا مختلف ہونا زکات کی درآمد اور فائدہ کے کم اور زیادہ ہونے میں اچھی طرح اثر انداز ہے نتیجۃً اسلامی سماج سے فقر و فاقہ کو دور کرنے میں بھی زبردست اثر ڈالتا ہے۔

شیعہ مذہب میں بچے اور دیوانے زکات کی ادائگی سے معاف ہیں مگر شیعہ مذہب کے مطابق ہر بالغ و عاقل مسلمان اور غیر مسلمان کے مال میں زکات واجب ہونے کی وجہ سے زکات کی درآمد کے لئے عظیم منبع مہیا ہو جاتا ہے، جب کہ اہل سنت کے چارو مذاہب اور ان کی جدید فقہ کے مطابق کافر کے مال میں زکات واجب نہیں ہے۔

زکات میں شامل ہونے والے اکیس موارد جو قومی ثروت کو شکل دیتے ہیں:

اہل سنت کے چارو مذہب کے مطابق ان اکیس موارد میں سے صرف ۱۲ یا ۱۴ موارد ہیں جن پر زکات واجب ہے اور ۷ یا ۹ اہم موارد ایسے ہیں جو اسلامی اقتصادی فریضہ سے

خارج ہیں، مگر امامیہ مذاہب میں شامل کئے گئے ہیں اگر خمس اوراس کے مصارف کو زکات اوراس کے مصارف سے الگ کر دیا جائے جیسا کہ مشہور بھی یہی ہے تو شیعہ فقہ کے مطابق آج کے اقتصاد میں سے صرف چار غیر اہم موارد مشمول زکات قرار پائیں گے اس لحاظ سے زکات کی آمدنی بہت کم ہو جائے گی۔

کلیدی الفاظ:۔زکات، خمس، اسلام کے فقہی مذاہب، غریبی۔

مقدمہ

کم از کم ضروریات زندگی کی فراہمی اور سماج سے فقر وفاقہ کو ختم کرنا باہمی زندگی کی ایک نیک آرزو ہے۔ اسلام نے زکات کو واجب قرار دے کر اس نیک آرزو کو قطعی طور سے پورا کیا ہے۔ یہاں تک کہ زکات کا وجوب ضرورت دین میں محسوب ہوتا ہے۔اس مقالہ میں سب سے پہلے بطور خلاصہ قرآن وحدیث اور شیعہ واہل سنت کی فقہ کے اعتبار سے زکات کی فضیلت اور منزلت کو بیان کیا جائے گا پھر ان مذاہب کے نظریات کے مطالعہ کے ذریعہ بتایا جائے گا کہ خود زکات کے وجوب پر بھی مذاہب کا اجماع ہے مگر زکات کن لوگوں پر واجب ہے اور کن چیزوں میں واجب ہے، اس میں ان مذاہب کے نظریوں میں اختلاف ہے آخر میں سرسری طور پر زکات کے قانون کو اسلامی حکومتوں میں کس طرح نافذ کیا گیا کو بیان کیا جائے گا۔

اسلامی مما لک میں زکات کی آمدنی کو بڑھانے کا سسٹم اور اسلامی سماج سے غریبی دور کرنے کی مدیریت اوراس کا قانون نافذ کرنے کا سسٹم کامیاب نہیں ہے لہٰذا فقر فاقہ وک دور کرنے میں بہت کم موثر ہوا ہے۔

یہ بات بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ یہ مقالہ صرف ایک تحقیق، مباحثہ اور اطلاع رسانی ہے اس کا مقصد فقہی نظریات میں سے ایک کو ثابت کرنا یا اس کی نفی کرنا نہیں ہے، کسی بھی فقہی نظریہ کو بیان کرنے میں اس کی اصل اور بنیاد اس مذہب کا مشہور ومعروف نظریہ ہے۔

ا۔ زکات لغت کے اعتبار سے

لغت میں زکات کے معنی زیادہ ہونا اور غور کرنا۔[1] مقاییس الغۃ میں لکھا ہے ''زاء، کاف اور حرف معتل'' اس کی اصل ہے جو زیاد ہونے اور نمو کرنے پر دلالت کرتا ہے۔[2] شوکانی اپنی کتاب ''نیل الاوطار'' میں لکھتے ہیں''

ا۔ المعجم الاقتصادی، احمد شرباصی، دار الجلیل بیروت ۱۴۰۱ھ

۲۔معجم مقاییس اللغة، ابوالحسن احمد بن فارس، دفتر تبلیغات اسلامی قم ۱۴۰۴ھ

جب کوئی چیز نمو کرتی ہے اور زیادہ ہوتی ہے تو ہم عربی میں کہتے ہیں ''زکا الشئ'' اور جب کوئی شخص نیک اور اچھا ہوتا ہے تو کہتے ہیں ''زکیٰ فلاں'' اور تطہیر کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ۱

راغب کی کتاب ''مفردات'' میں ہم پڑھتے ہیں ''اصل میں زکات پروردگار کی برکت کا ماحصل ہے م کہا جاتا ہے زکاالزرع یزکو۔ جب کھیتی نمو کرتی ہے تو برکت ہوتی ہے۔ ۲

بہت سی آیتیں جو زکات کی شان میں نازل ہوئی ہیں ان میں زکات کو صدقہ کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جیسے:

﴿خذ من اموالھم صدقة﴾ ۳

﴿و انما الصدقات للفقراء و المساکین ...﴾ ۴

پہلے زمانہ میں زکات جمع کرنے والوں کو مسلمان مصدق کہتے تھے چوں کہ وہ صدقہ جمع کر کے تقسیم کرتے تھے۔ ۵ ۔کتاب ''لسان العرب'' میں لکھا ہے: جو شخص صدقے جمع کر کے مستحقوں کے درمیان تقیم کرتا ہے اسے مصدق کہتے ہیں۔ ۶

زکات اصطلاح میں

مجمع البحرین میں لکھا ہے: ''اصطلاح میں زکات مخصوص صدقہ ہے جس کی مقدار بنیادی طور سے شریعت کی جانب سے معین ہو چکی ہے جو مال اور ذمہ دونوں میں ہے تاکہ دونوں پاک ہو جائیں زکات مال، مال کو پاک کرتی ہے اور فطرہ بدن کو پاک کرتا ہے۔ ۷

۱۔نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، محمد بن علی بن محمد شوکانی، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۳۴۷ھ، ج۴/ کتاب الزکاة ص/۹۷

۲۔مفرادات الفاظ القرآن، راغب اصفہانی، مرتضوی، تہران، ۱۳۷۳ھ

۳۔سورہ توبہ/۱۰۳

۴۔سورہ توبہ/۶۰

۵۔مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج/۵ص/۶۴، فضل بن حسن طبرسی، دارالمعرفة، تفسیر المیزان، ج/۹ص/۳۱۰، سید محمد حسین طباطبائی، موسسہ اسماعلیان، قم، تفسیر عیاشی، محمد بن مسعود عیاشی، تحقیق و تصحیح سید ہاشم رسولی محلاتی ج/۲ص/۹۰ مکتبہ علمیة اسلامیة، تہران، تفسیر شبر، سید عبداللہ شبر، ص/۲۰۶، دارالبلاغة۔

۶۔لسان العرب، ج/۴ص/۲۴۱۹، بن منظور، دارالمصریہ للتالیف والترجمہ، قاہرہ۔

۷۔مجمع البحرین، ص/۲۸۳، فخرالدین طریحی، دفتر نشر فرہنگ اسلامی ۱۴۰۸ھ

علامہ حلی لکھتے ہیں زکات لغت میں زیادہ ہونا، نمو کرنا اور تطہیر کرنا ہے اور شریعت میں اس حق کا نام ہے، جو مال میں واجب ہے، جس کے وجوب کے لئے نصاب معتبر ہے اور زکات کہے جانے کی وجہ یہ ہے کہ ثواب زیادہ ہوتا ہے، مسکینوں کے حق سے مال پاک ہو جاتا ہے اور زکات ادا کرنے والا زکات نکالنے کے سبب گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔[1] حاج رضا ہمدانی لکھتے ہیں زکات لغت میں طہارت و نمو کے معنی میں ہے اور عرف اہل شریعت میں اس حق کا نام ہے جس کی شناخت اہل شرع کو ہے اور کتاب اور جو متواتر سنت کے ذریعہ ان کے نزدیک ثابت ہو چکا ہے یہ نماز و روزہ کی طرح ضروریات دین میں سے ہے۔ اس کا انکار کرنے والا اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔[2]

دوسرے الفاظ میں ایک مخصوص مقدار ہے جس میں خاص شرائط پائے جانے کے بعد اس مال کے نکالنے کا حکم دیا جاتا ہے۔[3]

کتاب ''معجم الاقتصادی الاسلامی'' میں لکھا ہے زکات ایک حق ہے جس کا نکالنا مخصوص مال میں سے خاص افراد پر مخصوص وقت میں واجب ہے۔[4]

زکات مسلمانوں کے مال میں ایک دینی اور الزامی فریضہ (حق اللہ المعلوم) ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اپنے مخصوص نصاب تک پہنچ جائے اور اس پر ایک قمری سال پورا ہو جائے۔ دین اسلام میں اس لئے اسے زکات کہا گیا ہے کہ یہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہونے اور ان کے مال کے مستحقوں کے حقوق سے پاک ہونے کا سبب بنتا ہے۔

قرطبی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: زکات، تزکیہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی تطہیر کے ہیں، گویا زکات نکالنے والا اپنے مال کو محتاجوں کے اور دوسرے لوگوں کے حقوق سے کہ جن کا تذکرہ خداوند عالم نے کیا ہے پاک کر دیتا ہے۔[5]

۱۔ المعتبر فی شرح المختصر، ج۲ص۱، محقق حلی، موسسہ سید الشہدا، قم

۲۔ مصباح الفقیہ، ج۳ص۱، آقای رضا ہمدانی، مکتبۃ الصدر، قم

۱۔ کتاب الزکاۃ، حسین علی منتظری، ج۱ص۹، دفتر تبلیغات اسلامی قم، ۱۴۰۴ھ

۲۔ المعجم الاقتصادی الاسلامی، ج۱ص۹، احمد شرباصی

۳۔ الجامع لاحکام القرآن، محمد قرطبی، ج۱ص۳۴۳، دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۵ھ

زکات قرآن میں

قرآن مجید میں لفظ زکات ۳۲ مرتبہ آیا ہے، ۲۹ مرتبہ معرفہ کی صورت میں ۲۶ مرتبہ نماز کے ساتھ ایک آیت میں اور ایک مرتبہ ایک ہی سیاق میں نماز کے ساتھ البتہ الگ الگ ایتوں میں، اسی طرح زکات کا عنوان قرآن مجید میں صدقہ اور صدقات کے الفاظ میں ۱۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔[1]

زکات کا مالی عبادت کے عنوان سے نماز کے ساتھ جو ایک جسمانی عبادت ہے قرآن مجید میں ۲۶ مقامات پر ذکر ہونا ان دوواجب کے لازم وملزوم ہونے کی دلیل ہے

زکات کا نماز (جو کہ ستون دین ہے) کے ساتھ ہونا اس نظم وضبط کی بنیاد ہے جس پر سماجی زندگی استوار ہے، اس حد تک کہ گزشتہ انبیاء کے حکم کا جوہر ہے جیسا کہ قرآن مجید نے خود انبیاء جیسے جناب ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور اسماعیل علیہم السلام کی زبان سے اس امر کو اس طرح بیان کیا ہے۔

﴿ و جعلنا هم ائمة يهدون بامرنا و اوحينا اليهم فعل الخيرات و اقام الصلاة و ايتاء الزكاة و كانوا لنا عابدين ﴾

اور ہم نے سب کو پیشوا قرار دیا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور ان کی طرف کار خیر کرنے نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کی وحی کی اور یہ سب کے سب ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔ (سورہ انبیاء ۷۳/)

﴿ واذكر في الكتاب اسماعيل انه كان صادق الوعد و كان رسولا نبيا ۞ و كان يامر اهله بالصلاة و الزكاة و كان عند ربه مرضيا ﴾

اور اپنی کتاب میں اسماعیل کا تذکرہ کرو کہ وہ وعدہ کے سچے اور ہمارے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے۔ اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکات کا حکم دیتے تھے اور اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ (سورہ مریم ۵۴/ و ۵۵)

اسی طرح جناب عیسیٰؑ گہوارہ میں فرماتے ہیں:

﴿قال انى عبد الله آتانى الكتاب و جعلنى نبيا ۞ و جعلنى مباركا اين ما كنت و اوصانى بالصلاة و الزكاة ما دمت حيا﴾

---

[1] معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، محمد فواد عبد الباقی (تہران، انتشارات اسلامی۔ ۱۳۷۳ش)

کہا میں اللہ کا بندہ ہون اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور جہاں بھی رہوں با برکت قرار دیا ہے اور جب تک زندہ رہوں نماز اور زکات کی وصیت کی ہے۔

(سورہ مریم/۳۰و۳۱)

بنی اسرائیل سے عہد و پیمان کے سلسلہ میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

﴿و اذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا الله و بالوالدین احسانا و ذی القربیٰ و الیتامیٰ و المساکین و قولوا للناس حسنا و اقیموا الصلاۃ و اتوا الزکاۃ ثم تولیتم الا قلیلا منکم و انتم معرضون﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خبردار خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ، قرابتداروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا لوگوں سے اچھی باتیں کرنا، نماز قائم کرنا، زکات ادا کرنا، لیکن اس کے بعد تم میں سے چند کے علاوہ سب منحرف ہو گئے اور تم لوگ تو بس اعراض کرنے والے ہی ہو۔

(سورہ بقرہ/۸۳)

قرآن مجید اللہ کے برگزیدہ دین کی صفت اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿وما امروا الا لیعبدوا الله مخلصین له الدین حنفاء و یقیموا الصلاۃ و یوتوا الزکاۃ و ذلک دین القیمة﴾

اور انھیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ خدا کی عبادت کریں اور اس عبادت کو اس کے لئے خالص رکھیں نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں اور یہی سچا اور مستحکم دین ہے۔

(سورہ بینہ/۵)

سورہ توبہ کی آیت ۱۱ کے مطابق اللہ کی وحدانیت پر ایمان اور نماز کے ساتھ زکات ادا کرنے سے انسان مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہوجاتا ہے اور اخوت و برادری کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فان تابوا و اقاموا الصلاۃ و آتوا الزکاۃ فاخوانکم فی الدین ....﴾

پھر بھی اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔ (سورہ توبہ/۱۱)

اسی سورہ کی آیت نمبر ۵ بھی اسی مطلب کو بیان کرتی ہے:

﴿ فان تابوا و اقاموا الصلاة و آتوا الزكاة فخلوا سبيلهم ان الله غفور رحيم﴾

پھر اگر توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو کہ خدا بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

وہ اموال کہ جن پر فقہ میں زکات واجب یا مستحب ہے اس کی کچھ قسمیں قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں:

اول سونا چاندی

﴿والذین یکنزون الذهب و الفضة ولا ینفقونها فی سبیل الله فبشرهم بعذاب الیم ﴾

اور جو لوگ سونے چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے پیغمبرؐ آپ انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیں۔ (سورہ توبہ/۳۴)

دوم میوے اور کھیتی [۱]

﴿ کلوا من ثمره اذا اثمر و آتوا حقه یوم حصاده ... ﴾

تم سب ان کے پھلوں کو جب وہ تیار ہو جائیں تو کھاؤ اور جب کاٹنے کا دن آئے تو ان کا حق ادا کردو...۔ (سورہ انعام/۱۴۱)

سوم منافع تجارت

﴿ یا ایها الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم ... ﴾

اے ایمان والو اپنی پاکیزہ کمائی میں سے راہ خدا میں خرچ کرو۔ (بقرہ/۲۶۷)

چہارم وہ چیزیں جو زمین سے حاصل ہوں جیسے معدن

﴿ومما اخرجنا لکم من الارض ... ﴾

اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمھارے لئے خارج کیا ہے۔ (سورہ بقرہ/۲۶۷)

۱۔ اور ایک تفسیر کے مطابق حق الحصاد وہی زکات کی ادائیگی سمجھیں اور اسے زکات کے علاوہ کوئی حق شمار نہ کریں۔

پنجم سارے اموال

﴿**خذ من اموالهم صدقة تطهرهم و تزكيهم بها...**﴾

پیغمبرؐ آپ ان کے اموال میں سے زکات لیجئے کہ اس کے ذریعہ یہ پاک و پاکیزہ ہو جائیں۔(سورہ توبہ/۱۰۳)

﴿**و فی اموالهم حق للسائل و المحروم**﴾

اوران کے اموال میں مانگنے والے اور محروم افراد کے لئے ایک حق تھا۔

یہ پانچویں قسم عام ہے اوراس میں مال زراعت و مال صناعت اور مال تجارت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۴۔ زکات حدیث اور فقہ کی کتابوں میں

الف:۔زکات اہل سنت کی فقہی اور حدیثی کتابوں میں

ان کتابوں میں زکات کے سلسلہ میں صراحتاً بہت سی حدیثیں موجود ہیں لیکن ہم چند واضح حدیث کے بیان پر اکتفاء کرتے ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اسلامی یعنی شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو، ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھو اور جب مستطیع ہو جاؤ تو حج کرو۔[۱]

عبداللہ بن مسعود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:

ہم سب کو نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو بھی زکات ادا نہیں کرے گا اس کی کوئی بھی نماز قبول نہ ہوگی۔[۲]

اصبہانی نے نقل کیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص نماز پڑھ رہا ہے لیکن زکات ادا نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں، چہ جائے کہ اس کا کوئی عمل اس کے لئے مفید ہو۔[۳]

۱۔الجامع الصغیر فی احادث البشیر النذیر، ج۱/ص۴/۴۷۴، ح/۳۰۵۹ سیوطی، دارالفکر، بیروت ۱۴۰۱ھ

۲،۳، الترغیب والترغیب فی حدیث الشریف، ج۱/ص۵۴۰/، ح/۱۰، ۱۱، ۱۲، حافظ ابو محمد منذری، بیروت دا احیاء التراث العربی ۱۳۸۸ھ

براز نے علقمہ سے نقل کیا ہے کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: تمھارا اسلام اس وقت کامل ہوگا جب تم لوگ زکات ادا کروگے۔[1]

فقہائے اہل سنت کہتے ہیں: جو کوئی زکات کے واجب ہونے کا معتقد ہو اور زکات ادا نہ کرے اس سے زبردستی زکات وصولی جائے گی، اگر کوئی شخص سرزمین اسلام اہل علم کے درمیان زندگی بسر کررہا ہو اور زکات سے انکار کرے وہ مرتد ہے اور اس پر مرتد کے احکام جاری ہوں گے، تین مرتبہ توبہ کرنے کے لئے کہا جائے گا اور نہیں کرے گا تو قتل کردیا جائے گا اور حاکم پر واجب ہے کہ زکات کی ادائیگی سے انکار کرنے والے سے جنگ کرے یہاں تک کہ وہ زکات ادا کرے۔[2]

اس رو سے اہل سنت کے نزدیک صاحب نصاب پر زکات کے واجب ہونے کے علاوہ حکومت کی طرف سے زکات کا جمع کرکے اسے مستحق کے درمیان تقسیم کرنا بھی واجب ہے اور اس سے اجتناب نہیں کیا جاسکتا۔

اس حکم کے نافذ کرنے کے لئے بعض اسلامی ممالک نے لازمی طور پر زکات ادا کرنے کا طریقہ اپنایا ہے اور کچھ دیگر اسلامی ممالک نے آزادانہ رویہ اپنا رکھا ہے۔

ب:۔ زکات پیروان اہلبیتؑ (شیعہ) کی حدیثی اور فقہی کتابوں میں

وجوب زکات کے سلسلہ میں عبد اللہ بن سنان امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں جب آیت زکات ﴿خذ من اموالهم صدقة تطهرهم و تزكيهم بها... ﴾[3] ماہ رمضان میں نازل ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منادی کو حکم دیا کہ لوگوں میں یہ اعلان کردے کہ پروردگار عالم نے جس طرح تم پر نماز واجب قرار دی ہے اسی طرح زکات بھی واجب کی ہے۔[4]

۱۔الترغیب والترغیب فی حدیث الشریف، ج۱/ص۵۴۰، ح۱۰/، ۱۱، ۱۲، حافظ ابو محمد منذری، بیروت دااحیاء التراث العربی ۱۳۸۸ھ

۲۔ابن قدامہ، المغنی، (بیروت دار الکتاب العربی) ج۲/ص۴۳۵، محمد بن الشربینی مغنی المحتاج فی شرح المنهاج (بیروت دار احیاء التراث العربی) ۱۳۷۷ھ ج۱/ص/ ۳۶۸، سید سابق، فقہ السنۃ دار الکتاب العربی (بیروت) ج۱/ص۳۶۸/۔

۳۔سورہ توبہ/۱۰۳

۴۔محمد بن حسن حر عاملی، وسائل الشیعہ الی مسائل الشریعۃ (موسسۃ آل البیتؑ لاحیاء التراث ۱۴۱۳ھ ج۹/ص۹/ ح۱/

دوسری روایت میں عبداللہ بن سنان امام علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں'' پروردگار عالم نے جس طرح نماز کو واجب قرار دیا ہے اسی طرح زکات بھی واجب قرار دی ہے لہٰذا اگر کوئی شخص زکات کا مال حمل کرے اور علی الاعلان ادا کرے تو کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ پروردگار عالم نے امیروں کے اموال میں اس مقدار میں فقراء کے لئے حق قرار دیا ہے جو ان کے لئے کافی ہو اور اگر اللہ کی نگاہ میں فقراء کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہوتی تو یقیناً خداوند عالم اس سے زیادہ واجب قرار دیتا اور یقیناً فقیروں کا فقر ان کے حق کو ادا کرنے سے منع کرنے والوں کے سبب ہے نہ کہ وظیفہ کی وجہ سے۔[1]

کتاب'' وسائل الشیعہ'' میں، نماز قبول نہیں ہوگی مگر زکات کی ادائیگی کے بعد کے باب میں سولہ روایتیں نقل ہوئی ہیں۔

من جملہ شیخ طوسی معروف بن خربوذ کے حوالہ سے امام باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں'' بیشک اللہ نے زکات کو نماز کے ساتھ ساتھ قرار دیا ہے اور فرماتا ہے: و اقیموا الصلاۃ و آتوا الزکاۃ''یعنی اگر کوئی شخص نماز قائم کرے اور زکات ادا نہ کرے تو گویا اس نے نماز قائم ہی نہیں کی۔[2]

زکات کی ادائیگی سے منع کرنا حرام ہے اور اس سلسلہ میں کتاب وسائل الشیعہ میں ۲۹ روایتیں نقل ہوئی ہیں انھیں روایات میں سے ایک روایت شیخ طوسی محمد بن مسلم کے حوالہ سے امام محمد باقر سے نقل کرتے ہیں'' جو شخص بھی زکات میں ذرا بھی کمی کرے گا تو پروردگار عالم روز قیامت آگ کا ایک اژدہا اس کی گردن میں قرار دے گا اور وہ اس کا گوشت نوچے گا یہاں تک کہ وہ حساب و کتاب سے فارغ ہو جائے اور اس کی دلیل اللہ کا وہ قول ہے جس میں ارشاد فرماتا ہے''سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامۃ''[3] یعنی جو کچھ زکات میں کنجوسی کریں گے عنقریب وہ مال ان کی گردن میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔[4]

صاحب وسائل الشیعہ، زکات کے منکر اور زکات کی ادائیگی سے منع کرنے والے کے کفر وارتداد اور اس کے قتل کے جائز ہونے کے ثبوت میں نو روایتیں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ حوالہ گزشتہ، ج۹/ص۱۰/ح۳

۲۔ وسائل میں الشیعہ، باب تحریم منع الزکات، ص۲۲، ح۲

۳۔ سورہ آل عمران/۱۸۰

۴۔ وسائل الشیعہ، باب تحریم منع زکات، ص۲۲، ح۳

شیخ طوسی ابان بن تغلب کے حوالہ سے امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں: ''پروردگار عالم کی جانب سے دو لوگوں کا خون بہانا جائز ہے اور کوئی بھی انسان اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کرے گا یہاں تک کہ خداوند عالم قائم آل محمد عجل اللہ فرجہ شریف کو ظاہر کرے اور جب آپ کا ظہور ہوگا تو آپ اللہ کے حکم سے ان دو مسئلہ میں فیصلہ کریں یعنی زانی محصنہ کا سنگسار اور زکات کی ادائیگی سے منع کرنے والوں کی گردن اڑانا۔[۱]

شیعہ فقہا متفق علیہ طور سے زکات کے وجوب کو ضروریات دین میں شمار کرتے ہیں اور جان بوجھ کر انکار کرنے والے کو کافر سمجھتے ہیں۔[۲]

امام خمینیؒ فرماتے ہیں ''اصل وجوب زکات فی الجملہ ضروریات دین میں ہے اور بیشک جیسا کہ کتاب طہارت میں گزر چکا ہے اس کا انکار کرنے والا کفار کی جماعت میں ہے، اہل بیت علیہم السلام سے روایت ہے کہ'' ایک قیراط زکات منع کرنے والا نہ مومن ہے اور نہ ہی مسلمان'' اور اگر وہ چاہے تو یا یہودی مرے یا نصرانی مرے'' اور ''کوئی بھی درخت یا زراعت یا انگور کا مالک اگر زکات ادا کرنے منع سے کرے گا تو روز قیامت پروردگار عالم اسے اس کی گردن میں آگ کا سانپ بنا ڈال دے گا جو حساب و کتاب سے فارغ ہونے تک اس کے گوشت کو کاٹتا رہے گا۔

اس کے علاوہ دوسری روایتیں بھی ہیں جو عقل بشری کو حیران کر دیتی ہیں، مگر ہاں زکات کی فضیلت بھی بہت زیادہ ہے اور اس کا ثواب بہت عظیم ہے۔ صدقہ دینے جو زکات کو بھی شامل ہے کے بارے میں روایت میں آیا ہے کہ'' خداوند عالم صدقہ کو ویسے ہی بڑھاتا ہے جیسے تم میں سے لوگ اپنے بچے کو پروان چڑھاتے ہیں تاکہ روز قیامت جب انسان کو صدقہ ملے تو اس حالت میں کہ وہ کوہ احد کے برابر ہو گیا ہو''

نیز روایت میں ہے کہ'' صدقہ بری موت سے بچاتا ہے۔ چھپ کر دیا جانے والا صدقہ پروردگار عالم کے غضب اور عذاب کو ختم کر دیتا ہے'' اس کے علاوہ اور بھی روایتیں ہیں۔[۳]

۱۔ گزشتہ حوالہ، ص/۳۳، ح/۶

۲۔ محقق حلی، المعتبر فی شرح المختصر، قم موسسہ، سید الشہداء، ج/۲ص/۴۸۵، شیخ مفید، المقنعہ، قم جامعہ مدرسین، ۱۴۱۰ھ، ج/اص/۳۲۔ سید محمد کاظم طباطبائی یزدی، العروۃ الوثقی، ج/۴ص/۶۔ روح اللہ موسوی خمینی، تحریر الوسیلہ (قم، دفتر انتشارات اسلامی) ج/۲ص/۱۱ سید ابو القاسم خوئی الزکات (قم العلمیۃ ۱۴۱۳ھ ص/۹، سید محمد رضا گلپائگانی، مختصر الاحکام (قم دار القرآن الکریم) ص/۹۴)

۳۔ تحریر الوسیلہ، روح اللہ موسوی خمینی، ج/۲ص/۱۱

معلوم ہوا کہ اسلام کے مذاہب پنجگانہ، زکات کے وجوب اور اس کے ضروریات دین میں ہونے نیز جان بوجھ کر زکات سے انکار کرنے والے کے کفر ہے پر متفق ہیں اور سب کا نظریہ ایک ہے مگر فقہی نقطہ نظر سے فقر کو دور کرنے میں جو چیز زکات سے فائدہ اٹھانے میں موثر ہے وہ زکات میں شامل افراد اور اموال کی وسعت اور تنگی ہے اور اس سلسلہ میں مذاہب پنجگانہ کے فقہا کے نظریات مختلف ہیں اس لحاظ سے فقہی رائے کا انتخاب زکات کے وظیفہ کے کم یا زیادہ ہونے پر خاص اثر ڈال سکتا ہے، نتیجہ میں ضرورت اس بات کی پڑتی ہے کہ مذاہب پنجگانہ کا، زکات میں شامل افراد و اموال کی وسعت و تنگی کے لحاظ سے مطالعہ کیا جائے اور بحث و تحقیق کی جائے۔

۵۔ مذاہب پنجگانہ میں زکات میں شامل افراد و اموال کی تقابلی تحقیق، اور اہل سنت کی جدید فقہ

الف)۔ وہ افراد جن پر زکات مال ادا کرنا واجب ہے

اگر کوئی شخص بالغ، عاقل اور مسلمان ہے تو تمام مذاہب کے فقہا اس کے اس مال میں زکات کو واجب سمجھتے ہیں جب وہ مال حد نصاب تک پہنچ جائے اور اس سلسلہ میں سب کا اتفاق نظر ہے، لیکن اگر ایک یا دو شرط نہ پائی جائے تو ان کے درمیان اختلاف نظر ہے جس کی تفصیل ذیل میں مذکور ہے۔

حنبلی، مالکی، اور شافعی مذہب کا کہنا ہے کہ عقل اور بلوغ شرط نہیں ہے لہذا بچہ اور مجنون کے مال میں بھی زکات واجب ہے اور ان دونوں کے سرپرست پر واجب ہے کہ ان کے مال سے زکات ادا کرے۔[1]

لیکن حنفی مذہب تفصیل کے قائل ہیں اور غلات اربعہ میں بلوغ و عقل کی شرط کے قائل نہیں ہیں لہذا بچے اور دیوانے کے خرما، کشمش اور کاشت میں زکات کے وجوب کے قائل ہیں مگر دیگر اموال میں بلوغ و عقل کی شرطوں کے قائل ہیں۔[2] اہل سنت کی جدید فقہ کے مطابق غیر مکلّف کے مال میں زکات واجب ہے۔[3] مگر فقہائے امامیہ

۱۔عبد الرحمٰن جزیری، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، (بیروت دار احیاء التراث العربی، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء) ج۱/ص۵۹۰ والسید سابق فقہ السنۃ (بیروت دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء) ج۱/ص۲۹۴۔

۲۔عبد الرحمٰن جزیری، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، (بیروت دار احیاء التراث العربی، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء) ج۱/ص۵۹۰ وابن عابدین، رد المختار علی در المختار، (دار الفکر، ۱۴۱۵ھ) ج۲/ص۲۷۹و۲۸۰۔

۳۔محمد سلیمان اشقر و دیگران، قرارات الموتمر الثانی لمجمع الاسلامیۃ بالقاہرہ فی ابحاث فقہیۃ فی قضایا الزکاۃ المعاصرۃ (اردن، دار النفائس، ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۸ء) ج۲/ص۸۶۶۔

کی اس مسئلہ میں دو جماعت ہے ایک قدیم علماء جیسے شیخ مفید، شیخ طوسی جو اس بات کے معتقد ہیں کہ بچے اور دیوانے کے غلات اربعہ اور انعام ثلاثہ پر زکات واجب ہے اور سونے چاندی پر واجب نہیں ہے مگر اس صورت میں کہ اس سونے چاندی سے تجارت کی جائے تو شیخ مفید کا نظریہ یہ ہے کہ زکات واجب ہے اور شیخ طوسی کے نظریہ کے مطابق زکات مستحب ہے اور یہی نظریہ محقق حلی کا بھی ہے۔[1]

دوسرا گروہ جدید اور معاصر علماء کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ بلوغ و عقل زکات کے وجوب کی شرط ہے لہٰذا بچے اور دیونے کے مال میں زکات واجب نہیں ہے۔[2]

وجوب زکات کے شرایط میں سے ایک شرط اسلام ہے، حنفی، شافعی اور حنبلی مذہب کے نظریہ کے مطابق کافر پر زکات واجب نہیں چاہے کافر اصلی ہو یا مرتد ہو۔[3] جزیری مالکیوں کے الفاظ یوں نقل کرتے ہیں کہ کافر پر زکات اسی طرح واجب ہے جس طرح مسلمان پر واجب ہے بغیر کسی فرق کے۔ وہ کہتے ہیں کہ مالکیوں کی دلیل یہ ہے کہ اسلام زکات کے وجود کی شرط نہیں ہے بلکہ اسلام زکات کے صحیح ہونے کی شرط ہے لہٰذا ان کی نظر میں کافر پر زکات واجب ہے، ہر چند اسلام کے بغیر صحیح نہیں ہے۔ لیکن قرطبی کے بہ قول، امام مالک کا کوئی قول اہل ذمہ پر زکات واجب ہونے کے سلسلہ میں نقل نہیں ہوا ہے۔ [4] لہٰذا سمجھ میں یہی آتا ہے کہ مالکیوں کا فتویٰ یہی ہو کہ کافر سے زکات وصول کرنا ضروری نہیں ہے۔

مذہب امامیہ کے قدیم اور جدید علماء کے درمیان مشہور یہی ہے کہ کفار جس طرح اصول دین پر مکلّف ہیں اسی طرح فروع دین پر بھی مکلّف ہیں۔[5] اور معاصر علماء کا بھی یہی نظریہ ہے اور ان کی نظر میں کافر پر زکات

۱۔ شیخ المفید، المقنعہ، ص/۲۳۹، شیخ طوسی المبسوط، ج/۱ص/۲۳۴ و محقق حلی، المختصر، ص/۵۲۰

۲۔ شہید اول، الدروس، ج/۱ص/۲۲۹، شہید ثانی، الروضۃ البہیۃ، ج/۲ص/۱۱۰، النجفی، جواہر الکلام، ج/۱۵ص/۱۵، ہمدانی، مصباح الفقھیہ، ج/۳ص/۲، طباطبائی یزدی، العروۃ الوثقی، ج/۴ص/۵ و ۷، سید ابوالقاسم خوئی، الزکاۃ، ص/۱۰ و ۲۰، خمینی تحریر الوسیلہ، ج/۱ص/۳۱۱ و ۳۱۲ و محمد تقی بہجت توضیح المسائل (عربی) ص/۳۴۳

۳۔ عبد الرحمٰن جزیری گزشتہ، ص/۵۹۱، شافعی، کتاب الام (بیروت، دار الفکر، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) ج/۲ص/۲۹، محی الدین نوری، المجموع فی شرح المھذب، (بیروت دار الفکر) ج/۵ص/۳۲۷ و ۳۲۸، ابن مسعود بدائع الصنایع فی ترتیب الشرایع، (بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) ج/۲ص/۴ و یوسف قرضاوی، فقہ الزکاۃ (بیروت، موسسہ الرسالۃ، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء) ج/۱ص ۹۵

۴۔ ابن رشد، بدایۃ المجتھد ونھایۃ المقتصد، (بیروت، دار المعرفۃ، ۱۴۰۹ھ/۱۹۹۱ء) ج/۱ص/۲۴۵

۵۔۔ محقق حلی، المعتبر، ج/۳ص/۴۹۰، شیخ طوسی، الخلاف، ج/۱ کتاب الزکاۃ و نجفی، جواہر الکلام، ج/۱۵ص/۶۱۔۶۳

واجب ہے مگران سے صحیح نہیں ہے اور امام یا نائب امام زبردستی وصول سکتے ہیں اور اگر تلف کردیا ہوتو اس کا عوض کافر سے لے سکتے ہیں۔ ۱

اہل سنت کی جدید فقہ کے مطابق کافر پر زکات واجب نہیں ہے مگران کے بعض علماء استدلال کرتے ہیں کہ چوں کہ غیر مسلمان کو معاف کرنا جب کہ وہ حدود اسلام میں زندگی بسر کررہے ہیں اس بات کا سبب بنتا ہے کہ در آمد اور ثروت کی تقسیم عدل پر استوار نہ ہو اور غیر مسلمان کے پاس ثروت جمع ہو جائے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ زکات کے مساوی ٹیکس غیر مسلمان پر عائد کیا جائے اور اسلامی ممالک میں مقیم غیر مسلمانوں کی رفاہ کے لئے مصرف کیا جائے۔ ۲

مذاہب پنجگانہ اور اہل سنت کی جدید فقہ کے نظریہ کا خلاصہ زکات میں شامل افراد کے سلسلہ میں جدول نمبر ایک میں آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

ب)۔ اموال جن پر زکات واجب ہے

اموال، مال کی جمع ہے اور اعرابی جن کے درمیان قرآن نازل ہوا ہے کے نزدیک وہ ہر اس چیز کو شامل کئے ہوئے ہے جسے انسان چاہتا ہے اور اس کا مالک بن کر اس کی حفاظت کرتا ہے نتیجہ میں، اونٹ، گائے، بھیڑ بکری، زراعت، نخلستان اور سونے چاندی مال سب ہیں۔

کتاب ''لسان العرب'' میں ہے کہ مال ہر وہ چیز ہے جو ملکیت میں آسکے مگر یہ کہ بادیہ نشین اس کو حیوانات (گائے، بھیڑ بکری، اونٹ اور گھوڑے وغیرہ پر اطلاق کرتے ہیں اور شہر والے اکثر سونے چاندی پر اطلاق کرتے ہیں جب کہ سب کے سب مال ہیں۔ ۳

اہل سنت کے چارو مذاہب کے فقہا مال کی حد کے تعین میں حسب ذیل اختلاف رکھتے ہیں اور یہ اختلاف زکات کی مقدار کی جمع آوری کی کمی وزیادتی میں موثر ہوتا ہے۔

حنفیوں کے نزدیک مال ہر وہ چیز ہے جسے ملکیت میں لایا جاسکے اور عام طور سے اس سے فائدہ اٹھایا

۱۔ طباطبائی یزدی، العروۃ الوثقی، ج ۲، ص ۲۶ و خمینی تحریر الوسیلۃ، ج ۱، ص ۳۱۴

۲۔ Monzer Kahaf , Zakat and obligatory Expenditures in Islam . in LESSONS INISLAMIC ECONOMICS .1918 G Vol 2 p 532

۳۔ ابن منصور، لسان العرب، باب اللام، فعل المیم

جا سکے، اس لحاظ سے ان کے عقیدہ میں مالکیت دو چیزوں سے ثابت ہوتی ہے۔ ایک امکان ملکیت دوسرے عرفا امکان استفادہ لہٰذا جو چیز بھی زمین و ہوا میں ہم اپنے قبضہ میں لے لیں اور مالک بن جائیں نیز نقد پیسے اور دیگر سامان یہ سب کے سب مال ہیں اور اس طرح ہر وہ چیز کہ جو ابھی تک ملکیت میں نہ آئی ہو اور نہ ہی اسفادہ کیا گیا ہو مگر استفادہ کرنا ممکن ہو وہ بھی مال ہے۔

جیسے سارے مباحات'' دریا کی مچھلیاں، آسمان کے پرندے اور پہاڑی حیوان جن پر قبضہ کرنا اور استفادہ کرنا ممکن ہو، اس نظریہ کے مطابق ہر وہ چیز کہ جس پر قبضہ ممکن نہ ہو وہ مال محسوب نہیں ہوگی چاہے استفادہ کے قابل ہی کیوں نہ ہو جیسے، نور آفتاب اور سورج کی گرمی اسی طرح اگر عرف عام میں اس سے استفادہ نہ کیا جا سکے ہر چند احراز کے قابل ہی کیوں نہ ہو جیسے ایک مٹھی خاک، ایک قطرہ پانی اور ایک دانہ گندم: اس تعریف کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی بھی چیز مال نہیں ہے مگر یہ کہ وہ مادہ ہوتا کہ اس کی حیازت کی جا سکے اور اپنے قبضہ میں لیا جا سکے۔ اس بنیاد پر اعیان کے منافع جیسے گھر میں سکونت، مرکب پر سوار ہونا اور کپڑا پہننا مال محسوب نہیں ہوگا اس لئے کہ ان چیزوں کی حیازت ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اپنے اختیار میں لیا جا سکتا ہے اسی طرح حقوق۔ جیسے دودھ پلانا، حق ولایت اس کے علاوہ دیگر حقوق حنفی مذہب میں مال نہیں ہیں۔[1]

شافعی، مالکی، اور حنفی مذہب کا عقیدہ یہ ہے کہ منافع مال ہیں اس لئے کہ ان کے عقیدہ میں ضروری نہیں ہے کہ مال حیازت کے قابل ہو بلکہ ممکن ہے کہ اصل اور اس سے صادر ہونے والی چیزوں کی حیازت کے بعد منافع کی حیازت کی جائے، بلا شک منافع سے صادر ہونے والی چیزوں کی حیازت کے بعد منافع بھی حیازت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان منافع کے مالک دوسروں کو اس سے استفادہ کرنے سے منع کر سکتے ہیں، قانون گزار اور حقوق داں افراد اسی نظریہ کو اختیار کرتے ہوئے منافع کو مال محسوب کرتے ہیں اسی لئے مولفین حقوق اور ایجاد کی گواہی وغیرہ ان کے نزدیک معتبر ہے۔[2]

فقہائے امامیہ نے ہر چند مال کی بڑی وسیع تعریفیں کی ہیں مگر چوں کہ زکات کو صرف نو چیزوں میں واجب قرار دیا ہے اس لئے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف انھیں نو چیزوں کی زکات وصول کی تھی اور بقیہ چیزوں کو معاف کر دیا تھا لہٰذا اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۱۔ یوسف قرضاوی، فقہ زکات (بیروت، موسسہ الرسالۃ، ۱۴۱۲ھ) ج ۱/ص ۱۲۴

۲۔ یوسف قرضاوی، فقہ زکات (بیروت، موسسہ الرسالۃ، ۱۴۱۲ھ) ج ۱/ص ۱۲۵

امامیہ مذہب کے نظریہ کے مطابق جن نو چیزوں پر زکات واجب ہے وہ یہ ہیں۔ ا: تین قسم کے حیوانات (اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری) ۲: غلات اربعہ (گیہوں، جو، خرما اور کشمش) ۳: سونا چاندی کے سکے بنا بر قول صحیح تر۔ ان کے علاوہ دیگر چیزوں میں زکات واجب نہیں ہے بلکہ اکثر فقہا کی نظر میں باقی چیزوں میں زکات مستحب ہے۔[۱]

مگر ہاں فقہ امامیہ میں خمس کا موضوع بہت ہی وسیع اور برتر ہے جب کہ فقہائے اہل سنت خمس کو صرف غنائم جنگی میں قرار دیتے ہیں۔ امامیہ فقہ نے اس موضوع کے تحت غنائم جنگی کے علاوہ خمس کو معدن، جو مال سمندر میں غوطہ لگا کر نکالا جائے، مال حلال جو مال حرام میں مخلوط ہو جائے، وہ زمین جو کافر ذمی مسلمان سے خریدے اور دیگر منافع چاہے تجارتی ہوں یا غیر تجارتی سب میں شامل کیا ہے۔

سید مرتضیٰ زکات کے نو چیزوں میں منحصر ہونے کا سبب اس طرح بیان کرتے ہیں: ہمارے مذہب کی صحت پر اجماع کے علاوہ جو چیز دلالت کرتی ہے وہ اصل برائت ذمہ ہے یعنی انسان زکات سے بری الذمہ ہو اور یہ ادلہ شرعیہ سے معلوم ہوگا کہ کن چیزوں میں زکات واجب ہے، جن چیزوں میں فقہ امامیہ نے زکات کو واجب قرار دیا ہے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور ان چیزوں کے علاوہ پر کوئی قطعی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے، پس اصل برائت اپنی جگہ باقی ہے جس کی دلیل خداوند عالم کا قول ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''ولا یسئلکم اموالکم'' یعنی خدا تمہارے اموال میں کوئی حق واجب نہیں کرے گا اس لئے کہ خداوند عالم لوگوں کے مال میں سے کچھ نہیں چاہتا مگر کسی خاص وجہ سے اور آیت کا ظاہر اموال میں کسی حق کے واجب ہونے سے منع کر رہا ہے اور جو چیزیں اس اصل برائت سے خارج ہوئی ہیں وہ قطعی دلیل ہونے کے سبب خارج ہوئی ہیں ان کے علاوہ باقی چیزیں اسی ظاہر کے ما تحت باقی ہیں۔[۲]

فقیہ اہل سنت میں جناب ابن حزم نے بھی اسی طرح کا استدلال کر کے زکات کو صرف آٹھ چیزوں میں منحصر جانا ہے وہی آٹھ چیزیں جس کی زکات رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصول کرتے تھے ''اونٹ، گائے، بھیڑ بکری، گیہوں، جو، خرما اور سونا چاندی مگر کشمش کی زکات کے لئے ابن حزم کے نزدیک کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہوئی ہے۔[۳]

ا۔ شیخ مفید، مقنعہ، ص/۲۳۲، شیخ طوسی، الاقتصاد، ص/۲۷۶، النجفی، جواہر الکلام، ج/۱۵ص/۶۵، ۲۔ طباطبائی یزدی، العروۃ الوثقی، ج/۲ص/۲۸ وامام خمینی، تحریر الوسیلۃ، ج/۲ص/۱۰

۲۔ سید مرتضیٰ، الانتصار، چاپ شدہ در سلسلۃ الینابیع الفقیہہ، (بیروت الدار الاسلامیہ ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء) ص/۷۳

۳۔ ابن حزم اندلسی، المحلی (بیروت دار الفکر) ج/۵ص/۲۰۸

اب ہم مذاہب پنجگانہ اور اہل سنت کے جدید نظریات کو ان اموال کے بارہ میں جن کی دستہ بندی ثروت کے عنوان سے ذیل میں کی گئی ہے بیان کرتے ہیں:❁

۱)۔ کھیتی سے ملنے والی، جس میں غلات اربعہ اور زراعت سے حاصل ہونے والی بقیہ چیزیں شامل ہیں۔

۲)۔ حیوانی ثروت، جس میں اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری، چرنے والے گھوڑے شہد اور حیوانات سے حاصل ہونے والی چیزیں شامل ہیں۔

۳)۔ نقدی، جس میں سونے چاندی کے سکے، نوٹ، سونے چاندی کے زیور اور غیر تزئینی سونا چاندی شامل ہے۔

۴)۔ تجارتی ثروت، جس میں تجارتی اموال شامل ہیں۔

۵)۔ جنگی ثروت، جس میں مال غنیمت شامل ہے۔

۶)۔ ثروت مخلوط با حرام جس میں ہر طرح کا حلال مال جو حرام میں مخلوط ہو جائے شامل ہے۔

۷)۔ معدن، جس میں خزانہ، سونے چاندی کی کان اور دیگر کانیں شامل ہیں۔

۸)۔ دور حاضر کی ثروت، جس میں مستغلات (ہر وہ ملکیت جس میں آمدنی ہو)، عمارتیں، زمینی، ہوائی اور دریائی سواریاں (جیسے موٹر کار، ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز وغیرہ) کارخانے، کمائی کے منافع اور قرعہ اندازی سے حاصل ہونے والے فائدے وغیرہ شامل ہیں۔

اول:۔ زراعت کے ذریعہ حاصل ہونے والی ثروت

غلات اربعہ (جو گیہوں، کشمش اور خرما) پر زکات کے وجوب میں اہل سنت کے تمام مذاہب متفق ہیں ان سبھوں کا نظریہ یہ ہے کہ اگر بارش کے پانی سے کھیتی ہوئی ہے تو عُشر ۱۰ ر فیصد اور اگر سنچائی سے ہوئی ہے تو ۵ فیصد یعنی نصف عُشر زکات واجب ہے۔

حنفی مذہب کے علاوہ اہل سنت کے سارے مذاہب غلات اربعہ میں حد نصاب کو معتبر جانتے ہیں، حد نصاب ۵ ر وسق ہے اور ہر وسق ۶۰ صاع ہے، جو مجموعا ۹۱۰ کلو گرام کے لگ بھگ ہوتا ہے اس سے کم میں زکات واجب نہیں ہے مگر حنفی مذہب میں اس مقدار سے کم ہو یا زیادہ زکات واجب ہے۔ غلوں اور زراعت کی نوعیت میں ہر مذہب میں اختلاف ہے حنفی کہتے ہیں، سبزی، نرکٹ اور لکڑی کے علاوہ زمین سے نکلنے والی تمام چیزوں میں زکات واجب ہے۔

❁ ان نظریات کا مقصد جدول نمبر ۲ میں ذکر کیا گیا ہے

مالکی اور شافعی کہتے ہیں زکات ان تمام چیزوں میں واجب ہے جنھیں انسان سال بھر کے خرچہ کے لئے ذخیرہ کرتا ہے جیسے گیہوں، جو خرما اور کشمش، حنبلی کہتے ہیں: ہر وہ چیز جو تولی اور وزن کی جائے اس میں زکات واجب ہے۔[1]

لیکن امامیہ کے نظریہ کے مطابق زکات صرف غلات اربعہ، گیہوں، جو، خرما اور کشمش میں حد نصاب تک پہنچنے کے بعد واجب ہے اس کے علاوہ میں واجب نہیں ہے، ہاں مستحب ہے۔[2]

دوم:۔حیوانات

انعام ثلاثہ

مالکی مذہب کے علاوہ دیگر تمام مذاہب اس امر پر متفق ہیں کہ سائمہ (چرنے والے جانور) اور نصاب کی شرط کے ساتھ تین قسم کے حیوانات میں زکات واجب ہے وہ یہ ہیں (اونٹ، گائے (بھینس بھی شامل ہے) بھیڑ (بکری بھی شامل ہے) مگر مالکی مذہب میں سائمہ (چرنے) کی شرط نہیں ہے، اس نظریہ کے مطابق زکات ان تین قسموں میں واجب ہے چاہے سائمہ ہوں یا غیر سائمہ۔

سبھی مذاہب اس بات پر متفق القول ہیں کہ گھوڑا، خچر اور گدھے میں زکات واجب نہیں ہے، مگر یہ کہ مال التجارۃ (تجارت کے مال) کا جزو قرار پائیں۔[3] مگر حنفی مذہب گھوڑے اور گھوڑی میں دو شرط کے ساتھ زکات واجب جانتے ہیں شرط اول سائمہ ہو (چرنے والے) شرط دوم نسل بڑھانے کے لئے گلہ کی دیکھ بھال کی جارہی ہو۔[4]

شہد اور حیوانی محصولات کی زکات

حنفی اور حنبلی مذاہب میں شہد میں ۱۰ فیصد زکات واجب ہے، مالکی اور شافعی مذہب شہد میں زکات کے

۱۔عبدالرحمٰن جزیری ہمان، ص/۶۱۶ و ۶۱۹، یوسف قرضاوی، ہمان، ص/۳۴۱ و ۳۵۴، ابن رشد، ہمان، ص/۲۵۳ و محمد جواد مغنیہ، الفقہ علی المذاہب الخمسہ، (بیروت دالجواد، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) ص/۱۷۳۔

۲۔شیخ مفید، مقنعہ، ص/۲۸، شیخ طوسی النہایۃ، ص/۱۱۴ و ۱۱۵، محقق حلی شرائع الاسلام، ص/۳۵۷ و ۳۵۸، نجفی، جواہر الکلام، ج/۱۵ ص/۶۹، طباطبائی یزدی، العروۃ الوثقیٰ، ج/۲ ص/۲۸۸ و امام خمینی تحریر الوسیلہ، ج/۱ ص/۳۰۶

۳۔ابن رشد، ہمان، ص/۲۵۱، یوسف قرضاوی، ہمان، ص/۲۲۳، محمد جواد مغنیہ، ہمان، ص/۱۶۹۔

۴۔محی الدین نووی، ہمان، ج/۵ ص/۳۳۹

قائل نہیں ہیں۔قرضاوی تمام مذاہب کے نظریوں کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں شہد مال ہے اوراس کے ذریعہ تجارت کی جاتی ہے لہٰذا اس میں زکات واجب ہے۔[1]

سوم: نقدی ثروت

سونے چاندی کا سکہ اگر حدنصاب تک پہنچ جائے اور ایک سال تک باقی رہ جائے تو تمام مذاہب کے نزدیک اس میں زکات واجب ہے، چوں کہ اہل سنت کے چاروں مذاہب سکہ ہونا شرط نہیں سمجھتے لہٰذا وہ سونے چاندی کے بسکٹ اور ظروف میں بھی زکات کو واجب سمجھتے ہیں لیکن زیور وغیرہ میں صرف حنفی زکات کو واجب جانتے ہیں و مالکی، شافعی اور حنبلی واجب نہیں جانتے۔[2]

فقہائے امامیہ چوں کہ سونے چاندی میں زکات کے واجب ہونے میں سکہ رائج الوقت کو شرط سمجھتے ہیں لہٰذا سونے چاندی کے بسکٹ، ظروف اور زیور وغیرہ میں زکات کے وجوب کے قائل نہیں ہیں۔[3]

کاغذی پیسہ (نوٹ) اور دوسرے پیسے

اہل سنت کے چاروں مذاہب کے اکثر فقہا رائج روپئے اور پیسے میں زکات کے وجوب کے قائل ہیں اس لئے کہ ان کی نظر میں روپیہ اور نوٹ نے معاملات میں سونے چاندی کی جگہ لے لی ہے، شافعی کی نگاہ میں نوٹ اور روپئے کے ذریعہ معاملہ کرنا گویا بینک پر حوالہ (Order) ہے اس حوالہ کی قیمت کے اعتبار سے انسان اس ورق کا مالک بن جاتا ہے جو بینک کے ذمہ قرض ہے اور بینک مدیون ہے اور جب بھی ان اوصاف کے ساتھ مدیون ہوگا تو اس قرض کی زکات فوراً اور حالاً واجب ہے۔

حنفی فقہا کہتے ہیں کہ کاغذی روپئے قوی قرض کی مانند ہیں اور انھیں فوراً چاندی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے پس اس کی زکات بھی فوراً واجب ہے، مالکی فقہا کہتے ہر چند کاغذی روپئے قرض کی سند ہے مگر چوں کہ اسے فوراً چاندی میں تبدیل لیا جاسکتا ہے اور معاملات میں اس نے سونے کی جگہ لے لی ہے لہٰذا شرائط کے ہوتے ہوئے اس میں زکات واجب ہے۔

۱۔ یوسف قرضاوی، ہمان، ص/۴۲۵ و ۴۲۷۔

۲۔ ابن رشد، ہمان، ص/۲۵۱ و عبدالرحمٰن جزیری ہمان، ص/۶۰۱ و ۶۰۲

۳۔ شیخ مفید، مقنعہ، چاپ شدہ در: سلسلۃ الینابیع الفقہیہ، (بیروت، دارالتراث ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء) ج/۵، ص/۲۷ و ۲۸، شیخ طوسی النہایۃ، چاپ شدہ در ہمان، ص/۱۱۴، محقق حلی، شرائع الاسلام، چاپ شدہ در ہمان ص/۳۵۶، طباطبائی یزدی، العروۃ الوثقی، (تہران المکتبۃ العلمیۃ العلمیۃ الاسلامیۃ، ۱۳۶۳) ج/۲ص/۶۰۹ وامام خمینی، تحریرالوسیلہ، (موسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۴۲۱ھ/۱۳۷۹) ج/۱ص/۳۰۴

ان لوگوں کے نظریات کی بنیاد پر اسکناس (نوٹ) میں یہ قابلیت ہے کہ بغیر کسی مشکل کے اس کا چاندی سے معاوضہ ہوسکتا ہے لہٰذا یہ امر معقول نہیں ہے کہ لوگوں کے پاس نوٹ ہو اور حد نصاب کے برابر چاندی سے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہو مگر اس میں سے زکات نہ نکالیں۔

نتیجہ میں اہل سنت کے تین مذاہب، شافعی، مالکی اور حنفی کے فقہا کا نوٹ اور چک میں وجوب زکات پر اجماع قائم ہے صرف حنبلی مذہب والے اس مسئلہ میں مخالف ہیں ان کا کہنا ہے کہ نوٹ اور کاغذی پول میں زکات واجب نہیں ہے مگر یہ کہ اسے سونے چاندی میں تبدیل کر دیا گیا ہو اور زکات کی دیگر شرطیں بھی اس سونے چاندی میں موجود ہوں۔[1]

ان تمام اقوال کی اصل یہ ہے کہ یہ اوراق اور چک، صادر کرنے والے بینک پر قرض کی سند ہیں اور اس کی قیمت کے برابر فوراً چاندی میں بدل جائیں گے نتیجۃً ان کی زکات بھی واجب فوری ہے مگر حنبلی کے مذہب کے نزدیک اگر یہ تبدیل کرنا عمل میں آئے تو زکات واجب ہے ورنہ واجب نہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ آج کل مرکزی بینک نے نوٹ کو سونے چاندی میں بدلنے کا اقرار نامہ ختم کر دیا ہے اب بدلا نہیں جا سکتا لہٰذا ان سارے فتوؤں کی اصل درہم برہم ہو جاتی ہے۔

مگر امامیہ مذہب میں زکات کے نو چیزوں میں منحصر ہونے اور آج کل کے روپۓ پیسے کے مسکوک سونا چاندی نہ ہونے کی وجہ سے نوٹ اور چک میں زکات واجب نہیں ہے بلکہ اس مذہب میں خمس منافع کسب کا عنوان ایسا ہے جو ہر طرح کی درآمد کو شامل ہے۔

۱۔ عبدالرحمٰن جزیری، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، (بیروت دار احیاء التراث العربی، ۱۴۰۶ھ) ج ۱/ص ۶۰۵۔

حضرت فاطمہؑ امّہات المؤمنین کی نظر میں

سید احتشام عباس زیدی

خداوند عالم نے بزم انسانی کے اندر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر کسی کو خلق نہیں فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات قرآن کے آئینہ میں اخلاق کریمہ کا مجسمہ ہے جس کی گواہی قرآن مجید نے یہ کہہ کر دی ہے: ''**انک لعلی خُلُقٍ عظیم** ''[۱] پروردگار عالم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلقت کو کائنات کی خلقت کا سبب قرار دیا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور حدیث قدسی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدر و منزلت یوں بیان کی گئی ہے: ''**لولاکَ لَما خلقتُ الافلاک** ''[۲] اے میرے حبیب اگر آپ نہ ہوتے تو میں کائنات کو خلق نہ کرتا۔

انسان اللہ کی بہترین مخلوق ہے اور اللہ نے اسے مرد و زن کے قالب میں خلق کرنے کے بعد مختلف خاندان و قبیلے اور رنگ و نسل میں ڈھالا ہے[۳]، ساتھ ہی اس کی ہدایت کے لیئے نبیوں اور رسولوں کا ایک طولانی سلسلہ قائم کیا۔ راہ نور کی طرف ہدایت کرنے والے یہ انبیاء و مرسلین انسانوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم اور نور کی فضا میں لاتے رہے اور انہیں خدا سے قریب کرتے رہے۔ لیکن انہیں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے عناصر بھی تھے جو شیطان کے فریب میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوتے رہے یا خود شیطان بن کر دوسرے انسانوں کو گمراہیوں اور تاریکیوں مین ڈھکیلتے رہے۔ خداوند عالم نے مرد و زن کو اپنی الٰہی فطرت پر پیدا کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض و وظایف معین کیئے ہیں جو ان کی طبیعت، مزاج اور جسمانی ساخت سے ہماہنگی رکھتے ہیں گھر کی ساخت اور پرامن خانوادہ کی تشکیل کے لیئے بعض جہتوں سے مرد کو فوقیت دے کر یہ فرمایا کہ ''**الرّجالُ قوّامونَ علی النّساء** ''[۴] اور بعض جہتوں سے دونوں کی ایک دوسرے پر سرپرستی کو بیان کیا ہے ''**المؤمنونَ والمؤمنات بعضهم**

اولیاءُ بعض ''۵؎ اس طرح سے ذہن سے یہ بات دور کردی کہ عورت، مرد سے پست اور حقیر کوئی مخلوق ہے۔

جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا ظہور ہونے والا تھا اس دوران جاہل عربوں کے درمیان عورت انتہائی پست اور حقیر وجود تھی۔ لوٹ مار اور قتل وغارت کی زندگی بسر کرنے والے عرب اپنی شکست کے بعد اپنی جھوٹی بے عزتی اور بے آبروئی سے بچنے کے لیئے گھروں میں پیدا ہونے والی لڑکیوں کو زندہ دفن کردیتے تھے۔

پروردگار عالم نے ایسے ماحول میں اپنے حبیب رحمۃٌ للعالمین اور خلق عظیم پر فائز پیغمبر کو مرسل اعظم بنا کر بھیجا اور اپنی خاص حکمت کی تحت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیٹی عطا فرمائی اور اس کے لیئے اعلیٰ حسب ونسب سے آراستہ مکہ کی عظیم خاتون جناب خدیجہ کی آغوش کا انتخاب کیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور ومعروف حدیث جسے تمام علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے یعنی ''فاطمةُ بعضة منّی'' فاطمہ میرا ٹکڑا ہے۔ ممکن ہے اسی حکمت کے تحت ہو کہ ایک طرف تو بیٹی باپ کے وجود کا حصّہ ہوتی ہے اس اعتبار سے بھی قابل احترام ہے اور دوسری طرف حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود کا حصّہ ہونے کے سبب پوری امت کے لیئے محترم ہیں۔ اس لیئے کہ قرآن کریم پوری وضاحت کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عام انسان کے بجائے صرف رسول جانتا ہے ''وما محمّدا لاّ رسول۔۔۔'' ۶؎ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں، لہٰذا اس آیت کی روشنی میں حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا جزءِ رسالت ہیں۔

بہر حال بیٹی کی حیثیت سے عورت کے مرتبے اور اس کی منزلت کو بزم انسانی اور خصوصاً دنیائے اسلام میں نمایاں کرنے کے لیئے ہی قدرت نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شکل میں یہ گوہر آبدار عطا فرمایا تھا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عظیم عطیہ جو اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بخشا وہ کتنا قیمتی تھا یعنی حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کتنے صفات وکمالات کی حامل تھیں۔ اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے اسلامی اور قرآنی تعلیم کے گہوارے میں اپنی بیٹی کی کیسی تربیت فرمائی تھی۔

سردست اس مقالے میں اس گراں قدر شخصیت کی عظمت کا جائزہ امّہات المؤمنین کے اقوال میں لیتے ہیں، اور یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا ازواج پیغمبر کی نگاہ میں کس فضل وشرف کی حامل تھیں۔

جنّت کا میوہ :

دامن اسلام میں پروان چڑھنے والی اس نومولود دختر کی عظمت اور کرامت کے لیئے ہم یہاں سب سے

پہلے امّ المؤمنین عائشہ سے حسب ذیل روایت نقل کرتے ہیں جسے شیعہ اوراہل سنت دونوں علماء نے نقل کیا ہے کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفقت ومحبت سے اپنی بیٹی فاطمہ کا بوسہ لیا کرتے تھے عائشہ اس حالت کو دیکھ کر تعجب کرتی تھیں آخر انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرلیا کہ آپ اپنی بیٹی فاطمہ سے اس طرح محبت کا برتاؤ کرتے ہیں جیسے کسی سے نہیں کرتے ۔ میں نے نہیں دیکھا کے کوئی اس طرح اپنی بیٹی سے شفقت ومحبت کرتا ہو اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا حُمیراء : اِنّہُ لمّا کانَ لیلۃ اُسریَ بی اِلی السَّماءِ وکَّل اللّٰہُ "عزَّ وجلَّ بی جبرئیلَ فاَوقفنی علیٰ شجرۃٍ من شجرِ الجنّۃ ... فتناوَلتُ ثمرۃً من ثمرِھا فاَکتُھا فصارت نطفۃً فی صُلبی فلمّا ھبطتُ الیٰ الارضِ واقعتُ خدیجۃَ فحملت بفاطمۃَ ، فاذا اِشتَقتُ اَلیٰ رائحۃِ الجنَّۃِ شمَمتُ فاطمۃَیا حمیراءُ :انَّ فاطمۃَ لَیسَت کَنساءِ الآدمیّین وَ لا تَعتَلُ کما یَعتَللنَ "

''اے حمیرا: (یہ حضرت عائشہ کا لقب تھا) جس رات مجھے معراج لے جایا گیا جبرئیل نے مجھے جنت کے درختوں میں سے ایک درخت کی طرف رہنمائی کی۔ ۔ ۔پس میں نے اس درخت کا پھل کھایا، جو میری صلب میں قرار پا گیا اور جب میں واپس ہوا اور خدیجہ کے پاس گیا تو اس سے فاطمہ وجود میں آئیں۔لہٰذا جب بھی میں جنت اور اس کی خوشبو کا مشتاق ہوتا ہوں تو فاطمہ کو سونگھتا ہو اور اسے بوسہ دیتا ہوں اے حمیرا: فاطمہ دنیا کی دوسری عورتوں کے مانند نہیں ہے اور نہ ماہانہ نجاست میں مبتلا ہوتی ہے''[۷]

مذکورہ بالا روایت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا عام اور معمولی خواتین کی طرح نہیں تھیں بلکہ دختر رسالت مآب اور رحمۃ للعالمین کی لخت جگر ہونے کے سبب عام عورتوں سے جدا،عظیم خصوصیات کی حامل تھیں،جنھیں اسلامی مآخذ میں حضرت کے فضائل وکمالات کی فہرست میں دیکھا جاسکتا ہے۔

فاطمہ سلام اللہ علیہا رحم مادر میں :

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل بن عمر سے ایک حدیث بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب پیغمبر

اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے جناب خدیجہ سے شادی کی تو مکہ کی عورتوں نے جناب خدیجہ سے رابطہ توڑ لیا۔ نہ ان کے گھر جاتی تھیں اور نہ ان کو سلام کرتی تھیں:

"...فلمّا حملَت بفاطمةَ علیها السلام کانت فاطمةُ تُحدثها مِن بطنِها و تصبرُها و کانَت تکتُمُ ذٰلکَ مِن رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم فدَخلَ رسول الله صلی الله علیه و آله و سلمیوماً فسمعَ خدیجةُ تُحدّثُ فاطمةَ فقالَ لها :یا خدیجة! مَن تُحدّثین ؟ قالَت : انَّ الجنینَ ا لّذی فی بطنی یُحَدّثنی ویونِسُنی ! قال: یا خدیجة! هذا جبرئیلُ یُخبرُنی انَّها انثیٰ و أنّها النّسلة الطاهرة المَیمُونه و أنَّ الله تبارَکَ و تعالیٰ سَیجعلُ نسلی منهاو سَیَجعلُ مِن نسلِها ائمةً..." [8]

"---جب جناب خدیجہ کے بطن میں جناب فاطمہ آئیں، تو آپ اپنی ماں سے باتیں کرتی تھیں، اور انھیں صبر دلاتی تھیں۔ جناب خدیجہ اس بات کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے چھپاتی تھیں، ایک روز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے خدیجہ کو کسی سے بات کرتے ہوئے سنا۔ حضرتؐ نے دریافت فرمایا کہ اے خدیجہ آپ کس سے باتیں کررہی تھیں تو انھوں نے کہا: یارسول اللہؐ! میرے شکم میں جو بچہ ہے وہ میری تنہائی کا مونس ہے اور مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: اے خدیجہ! یہ جبرئیل ہیں اور مجھے خبر دے رہے ہیں کہ یہ بچہ دختر ہے۔ اس سے پاکیزہ نسل وجود میں آئے گی اور میری نسل بھی اسی بیٹی سے ہوگی اور اس کی نسل سے ائمہ پیدا ہوں گے---"

مذکورہ روایت سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ جناب خدیجہ جیسی مکہ کی باعظمت خاتون نے جب اخلاق و کردار کے عظیم پیکر اور بظاہر مادّی اعتبار سے کم درجہ کے انسان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی کی تو دنیا کی ظاہری شأن وشوکت پر مرنے والی عرب خواتین نے جناب خدیجہ سے رابطہ توڑ لیا، لیکن جناب خدیجہ نے اس کا کوئی ملال نہ کیا اور اپنے عظیم اخلاق

وکردار کے حامل شوہر کی وفادار رہیں۔ یہ بات جناب خدیجہ کے اعلیٰ کردار کی عکاسی کرتی ہے۔

دوسرے یہ کہ خداوند عالم نے ایسی پاکیزہ خاتون کی تنہائی اور افسردگی کو دور کرنے کے لیئے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو اس وقت ان کا مونس بنا دیا جب آپؑ ماں کے شکم میں تھیں۔

تیسری بات یہ کہ جبرئیل نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیٹی کی بشارت دی جو خدا کی نظر میں عورت کے مرتبے کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا احساس بیٹی یا عورت کے سلسلہ میں آنحضرتؐ کے ہر امتی کو ہونا چاہیئے۔

چوتھی بات یہ کہ اگر چہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا نے ایک بیٹی دی لیکن اسی سے آپ کی پاکیزہ نسل کا سلسلہ جاری ہوا اور اس سلسلہ میں علمائے اسلام نے بے شمار روایتیں نقل کی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ذریعہ صلب حضرت علی علیہ السلام سے چلی۔

اور آخری بات یہ ہے کہ آپ ہی کی نسل سے روئے زمین پر ائمہ اور خلفائے الٰہی وجود میں آئے۔۔۔

ولادت حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا:

جب حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ولادت کے آثار ظاہر ہوئے تو حضرت خدیجہ نے مکہ کی عورتوں کو مدد کے لیئے بلایا لیکن انھوں نے آنے سے انکار کر دیا، جس پر جناب خدیجہ بہت غمزدہ ہوئیں۔ اس وقت پروردگار عالم نے چار جنّتی عورتیں غیبی امداد کی شکل میں جناب خدیجہ کے پاس بھیجیں۔ ان خواتین نے آکر اپنا تعارف کرایا، کہ اے خدیجہ آپ پریشان نہ ہو ہم خداوند عالم کی طرف سے آپ کی مدد کو آئے ہیں۔ میں ''سارہ'' زوجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں، یہ ''آسیہ'' بنت مزاحم ہیں جو جنت میں آپ کی ہمنشین ہیں، وہ ''مریم'' بنت عمران ہیں اور وہ ''کلثوم'' خواہر جناب موسیٰ علیہ السلام ہیں۔۔۔ اس طرح ان خواتین کی مدد سے جناب فاطمہ زہرا کی ولادت کے مراحل طے ہوئے آپ کو آب کوثر سے غسل دیا گیا، اور جنت کا لباس پہنایا گیا۔ پھر وہ خواتین آپ سے ہم کلام ہوئیں۔ اس وقت حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

> **''أشهدُ اَن لا اِلٰه الّا اللّٰه، و أنّ ابی رسُول الله سَیدُ الانبیاءِ، و انّا بَعلی سَیّدُ الاوصیاء، و وُلدی سادةُ الاسباط، ثُمَّ سلَّمت علیهنَّ و سمَّت کلُّ واحدةٍ مِنها بأسمها...''** [۹]

میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، اور میرے پدر بزرگوار اللہ کے رسول اور تمام انبیاء کے سید و سردار ہیں، میرے شوہر سید الاوصیاء ہیں اور میرے بیٹے انبیاء کے بہترین نواسے ہیں۔ پھر آپ نے ان تمام خواتین کو سلام کیا اور ایک ایک کر کے سب کا نام لیا۔۔۔

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آئینہ:

نبی امّت کا راہنما بھی ہوتا ہے اور باپ بھی ۔ جب ہم امّت کے لیئے پیغمبر کی مربیانہ اور مشفقانہ صلاحیتوں کو ان کے باعظمت اور باوفا اصحاب میں جلوہ گر دیکھتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدّو عربوں میں سے صفات و کردار و اخلاق کے کیسے کیسے لعل و جواہر ڈھالے تو ہمیں یہ سوچنے میں کوئی تردد نہیں ہوتا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے اپنی پارہ جگر کی پرورش اور تربیت کے لیئے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔

زیرنظر روایت جو حضرت عائشہ سے نقل ہے اس کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے:

''عن عائشةَ قالت: ما رأيتُ احداً اَشبهُ سَمتاً و دلّاً و هدياً برسول الله فی قِیامها و قُعُودها مِن فاطمةَ بِنتِ رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم''۱۰

''حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے کسی کو بھی سکوت کلام اور رفتار میں (اخلاق و کردار) نشست اور برخاست میں فاطمہ سے زیادہ رسول خدا کے مشابہ نہیں پایا''

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے اپنی پارہ جگر کو اپنی سیرت و کردار ،اور اپنے ظاہر و باطن کا مکمل آئینہ بنا دیا تھا۔

عظمتوں کا احترام:

باپ اپنی بیٹی کو بہت چاہتا ہے اور بیٹی بھی فطرتاً باپ سے بہت مانوس ہوتی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی بیٹی سے محبت اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی اپنے مشفق باپ سے محبت تو فطرت کی دین تھی ،لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ان دو شخصیتوں کی اک دوسرے سے محبت اور ایک

دوسرے کے لیئے احترام صرف اس انسانی فطری تقاضے کی تحت نہیں تھا، بلکہ یہ دو بزرگوار اللہ تعالیٰ کی کائنات میں اخلاق اور سیرت کا بے مثل شاہکار تھے اور جس کا اخلاق جتنا بلند ہوگا وہ دوسرے صاحب اخلاق کا اتنا ہی احترام کرے گا۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیئے ارشاد ربّانی ہے کہ: انکَ لعلیٰ خلُقٍ عظیم بے شک آپ خلق عظیم پر فائز ہیں۔ یعنی عظیم الٰہی اخلاق کا مرقع ہیں تو حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا بھی جزءِ رسالت ہیں۔ حسب ذیل روایت سے اس نکتہ پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

''قالت عائشةَ: ما رأیتُ احداً مِن خلقِ الله اَشبهُ حدیثاً و کلاماً برسول الله مِن فاطمةَ و کانَت اِذا دَخلَت علیهِ اَخذَ بیدِها فقبَّلَها و رحَّب بِها و اَجلَسَهافی مَجلِسِه وَ کانَ اِذا دَخَلَ عَلیها قامَت اِلیهِ و رَحَّبَت بِهِ و اَخذَت بِیدِه فقَبَّلَتها'' [۱۱]

''حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے کسی کو اللہ کی مخلوق میں نہیں پایا جو گفتگو اور کلام میں فاطمہ سلام اللہ علیہا سے زیادہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہت رکھتا ہو جب بھی فاطمہ سلام اللہ علیہا پیغمبرؐ کی خدمت میں تشریف لاتی تھیں تو پیغمبر آپ کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ دیتے تھے، آپ کو خوش آمدید کہتے تھےاور اپنی جگہ پر بیٹھاتے تھے۔ اور جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاطمہ سلام اللہ علیہا سے ملاقات کو جاتے تھے تو فاطمہ سلام اللہ علیہا ان کے احترام میں کھڑی ہوتی تھیں، انھیں خوش آمدید کہتی تھیں اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چومتی تھیں''

صدیقہ کبریٰ:

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا صفات و کردار کے اعتبار سے اپنے پدر بزرگوار کا بے مثل نمونہ تھیں۔ قرآن کریم نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی گواہی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ''و ما ینطِقُ عنِ الهویٰ اِن هوَ الّا وحیٌ یوحیٰ'' [۱۲] کہ وہ اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں بولتے، وہی کہتے ہیں جو ان پر وحی ہوتی ہے۔ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا اس صفت میں بھی اپنے پدر بزرگوار کی مکمل تصویر تھیں۔ اس کی گواہی ذیل کی روایت دیتی ہے اگرچہ بہت سے مسلمان آپ کو اس صفت سے یاد نہیں کرتے لیکن خود حضرت عائشہ نے بڑے شدّ و مد کے ساتھ یہ جملہ کہا ہے جسے علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے:

" قالَت عائشةَ: ما رأيتُ احداً قطُّ اصدقَ مِن فاطمةَ سلام الله عليها غيرَ ابيها (صلى الله عليه و آله و سلم) " ۱۳؎

میں نے ہرگز کسی کو فاطمہ سے زیادہ سچا نہیں پایا سوائے ان کے بابا کے۔

رازِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگہبانی:

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی جانب سے الٰہی رسالت کے نمائندے تھے لہٰذا کبھی وہ بھری بزم میں اپنی بات کہتے تھے اور کبھی کسی سے راز کے انداز میں بیان کرتے تھے ظاہر ہے کہ جو بات راز میں کہی جائے اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ نہیں چاہتے کہ اس شخص کے علاوہ کوئی اور اس سے آگاہ ہو۔ لہٰذا ہر امّتی کا فریضہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راز کو راز رکھے اور اسے افشاء کر کے اللہ و رسول کے عتاب کا شکار نہ ہو۔ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے بظاہر ایک عام سی بات کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ سے راز میں کہی تھی، آں حضرت کی حیات کے بعد تک مخفی رکھا اور حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد بیان کیا۔ ذیل کی دو روایتیں ملاحظہ فرمائیے:

> "حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ ایک روز پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری کے حالت میں جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ان کے پاس آئیں آپ ایسے راہ طے کر رہی تھیں جیسے پیغمبر چل رہے ہوں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے کان میں کچھ کہا جس پر آپ رونے لگیں۔ پھر دوبارہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے کان میں کچھ کہا تو فاطمہ سلام اللہ علیہا ہنسنے لگیں۔ میں نے فاطمہ سلام اللہ علیہا سے اس بارے میں سوال کیا تو فاطمہ سلام اللہ علیہا نے فرمایا: کہ میں پیغمبر کا راز ظاہر نہیں کروں گی۔" ۱۴؎

> "جناب ام سلمیٰ کہتی ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو اپنے پاس بلایا اور ان کیکان میں کچھ کہا، جسے سن کر فاطمہ سلام اللہ علیہا رونے لگیں، پھر آپ نے ایک اور بات فاطمہ سلام اللہ علیہا کے کان میں کہی جس کو سننے کے بعد فاطمہ سلام اللہ علیہا ہنسنے لگیں۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو میں نے فاطمہ سلام اللہ علیہا سے ان کے رونے اور ہنسنے کے بارے میں پوچھا تو

آپ نے فرمایا: کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے مجھے اپنی موت کی خبر دی تو میں رونے لگی پھر جب آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میں جنت کی عورتوں کے سردار ہوں تو میں خوش ہوگئی'' ۔۱۵

مختصر یہ ہے کہ جس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی تمام مسلمانوں کے لیئے اسوۂ حسنہ اور نمونہ عمل قرار دی گئی ہے اسی طرح بضعت الرّسول حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی پاکیزہ سیرت بھی ہمارے لیئے نمونہ عمل ہے ۔ آپ سلام اللہ علیہا کی مختصر حیات امّت کی تمام عورتوں کے لیئے اللہ کی اطاعت، عبادت اور بندگی اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی اطاعت و پیروی کا بہترین مرقع ہے یہ آپ کی درخشاں سیرت تھی جس کا وصف آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محترم ازواج نے بھی بیان کیا اور اس عہد کی اہم شخصیتوں نے بھی آپ کی شأن میں رطب اللّسانی کی ہے ۔ حسن بصری جو عالم اسلام کی ایک مشہور شخصیت ہیں حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی عبادت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''ما کانَ فی هذهِ الا مّة ِ أعبَدُمِن فاطمةَ سلام الله علیها کانَت تقومُ حتّیٰ تتورَّمَ قدماها'' ۱٦

امت اسلام میں کوئی بھی شخص حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا سے زیادہ عبادت گزار نہیں تھا آپ نماز کی حالت میں اس قدر کھڑی رہتی تھیں کے آپ کے پاؤں سوج جاتے تھے ۔

منابع و مآخذ:

۱۔سورہ قلم ر آیت ۹

۲۔حدیث قدسی

۳۔سورہ حجرات ر آیت ۱۳

۴۔سورہ نساء ر آیت ۳۴

۵۔سورہ توبہ ر آیت ۷۱

٦۔آل عمران ر آیت ۱۴۴

۷۔فرائد السمطین رج ۲، ص ٦۱ ،شمارہ ۳۸٦ و ص ۵۱ شمارہ ۳۸۱ ۔کنز العمال رج ۱۲، ص ۱۰۹، ش ۳۴۲۲۸ مختصر فرق

کے ساتھ۔

۸۔جلاء العیون شبر رج ا،ص ۱۲۱۔۱۲۲

۹۔عوالم۔ج ۱۱،ص ۲۰۲۔فضائل الخمسہ رج ۳،ص ۱۵۴۔نقل از ذخائر العقبیٰ رص ۴۴

۱۰۔صحیح ترمذی دار الفکر ربیروت ،۱۴۱۴ھ۔ج ۵،ص ۴۶۶،حدیث نمبر ۳۸۹۸

۱۱۔عقد الفرید ابن عبد ربّہ ربیروت ،۱۴۰۹ھ۔ج ۳،ص ۲۳۰

۱۲۔سورہ نجم رآیت ۳

۱۳۔مناقب آل ابی طالب ابن شہراشوب۔انتشارات علامہ قم رج ۳،ص ۳۴۱۔

۱۴۔مسند احمد ابن حنبل رج ۶، ص ۲۸۲ ردار صادر۔بیروت

۱۵۔خصائص نسائی رحدیث نمبر ۱۲۸۔نیز سنن ترمذی رجلد ۵،ص ۱۰۷،حدیث ۳۸۷۳۔مسند ابویعلی رجلد ۱۲،ص ۱۱۰،

حدیث ۶۷۴۳ وص ۳۱۲،حدیث ۶۸۸۶۔

۱۶۔مناقب آل ابی طالب ابن شہراشوب۔انتشارات علامہ قم رج ۳،ص ۳۴۱۔

آج کی دنیا میں مسلمانوں کی حالت

(دوسرے ادیان کے پیروؤں کی نسبت مسلمانوں کے حالات کا جائزہ)

ڈاکٹر مہدی محسنیان راد (امام صادقؑ یونیورسیٹی کے، فرہنگ وارتباط کالج کی ہیئت علمی کے رکن)
ترجمہ: سید قلبی حسین رضوی

خلاصہ:

اس مقالہ میں، ''عالم اسلام'' کی عملی تین تعریفوں میں سے ایک کی بیناد پر حال اور مستقبل میں جمعیتی معیاروں کے لحاظ سے دوسرے ادیان کی نسبت دنیا کے مسلمانوں کے حالات کا اس کی افزائش اور بعض ادیان کے مقابلہ اس کے اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اوراسی طرح دوسری ادیان سے مقائسہ کیا گیا ہے۔

مضمون نگار نے دکھایا ہے کہ مستقبل کے پچاس برسوں کے دوران عیسائی اور بدھسٹ روبہ زوال ہیں اور مسلمانوں میں افزائش پیدا ہونے والی ہے البتہ یہ افزائش ترقی اور پسماندگی کے ہمراہ ہوگی۔ اس بنا پر مقالہ نگار نے ان کے بعض اسباب وعلل کی طرف توجہ کی ہے اور مندرجہ ذیل مظاہر کے میزان کے پیش نظر عالم اسلام کا دوسرے ادیان سے موازنہ کیا ہے: انسانی ترقی (hid) اوراس کے مظہر کے جزئیات (زندگی کی امید، شرح

تعلیم،تعلیمی مقام، فی کس ناخالص پیداوار)، ذریع ابلاغ(mci)اور اس کے خزئیات (مطبوعات، ریڈیو اور ٹی وی) تک دسترس کی شرح ،انفارمیشن ٹیکنا لوجی اور ارتباات(icti)اوراس کے جزئیات (انٹرنیٹ، کامپیوٹر، موبائل اور ٹیلیفون تک دسترس کی شرح اور ذرائع ابلاغ (pfi) جہان اسلام اور دوسرے ادیان میں ان کی آزادی کا موازنہ کیا گیا ہے۔

عالم اسلام کی سرگرمیوں سے متعلق تین تعریفیں

پہلی تعریف:

عالم اسلام کی سب سے زیادہ قانونی تعریف عبارت ہے:''۵۴ ممالک پر مشتمل اسلامی کانفرنس کے اراکین۔''

اسلامی کانفرنس کے اراکین ممالک کی آبادی ایک ارب ۲۳ کروڑ اور ۸۳ لاکھ ہے جو دنیا کی کل آبادی کا تقریباً ۲۰/۹ فیصد ہے۔لیکن یہ پوری آبادی دنیا کے مسلمانوں کی نمائندہ نہیں ہے، کیونکہ ایک طرف ۵۴ ممالک میں سے ۱۱ ممالک میں مسلمانوں کی آبادی ۵۰ فیصد سے کم ہے اور دوسری طرف کچھ ایسے ممالک ہیں جن کا اس کانفرنس میں رکنیت حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔مثال کے طور پر اس کانفرنس کے اراکین ممالک میں سے ایک افریقی ملک گابون ہے کہ عالمی جغرافیہ کے دائرۃ المعارف نے اس ملک کی بارہ لاکھ آبادی میں ۸۴ فیصدی عیسائی اور باقی آبادی کو''انیمیسٹ'' ذکر کیا گیا ہے۔[۱] اور بعض منابع نے گابون میں مسلمانوں کی آبادی صرف دو فیصد ذکر کی ہے۔[۲]

حقیقت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلامی کانفرنس کی تنظیم عالم اسلام کی مظہر ہونے کے بجائے زیادہ تر ایک سیاسی، مذہبی اجتماع ہے۔

۱۔ 1,new york mcgrow hill inc world geographical ency clopedia, 1994

۲۔ عالم اسلام کا نقشہ (۱۹۷۸ء)، دنیا میں ایک ارب سے زیادہ مسلمان کا پھیلاؤ، موسسہ جغرافیائی سحاب

دوسری تعریف:

عالم اسلام کی دوسری تعریف میں وہ ممالک ہیں، جن کی اکثر آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ مظہر اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ مستقبل میں اکثریتی رائے پر مبنی جمہوری نظاموں کی تشکیل وسعت پا رہی ہے۔ یہ وسعت اس قدر ہے کہ ''فوکویامہ'' اس کے نتیجہ کو ''تاریخ کا خاتمہ'' کہتے ہوئے لکھتا ہے: ''گزشتہ چند برسوں کے دوران، لیبرل ڈیموکریسی کا نظام پر اپنے آئیڈیالوجک رقیبوں جیسے: وراثتی سلطنت، فاشیزم اور ان میں سب سے جدید رقیب کیمونزم پر دنیا بھر میں کامیابی پانے کے ساتھ ساتھ تنہا کامیاب حکومتی نظام کے عنوان سے لیبرل ڈیموکریسی کی قانونی حیثیت کے سلسلہ میں ایک اہم اتفاق نظر وجود میں آیا ہے۔ ممکن ہے لیبرل ڈیموکریسی، انسان کی آیئڈیالوجی کا ارتقائی اور اختتامی نقطہ اور انسان کی حکومت کی آخری شکل ہو اور اس مقام پر ''انتہائے تاریخ'' کو تشکیل دے۔ لیکن حقیقت میں کیمونزم کی ناکامی، مغربی لیبرل ازم کی قدروں کی کامیابی اور آئیدیالوجی کے تصادم کے خاتمہ کی دلیل ہے۔''[۱]

دنیا میں ۴۵ ایسے ممالک ہیں جن میں مسلمانوں کی آبادی ۱۰۰ فیصد سے ۵۰ فیصد تک ہے۔ مذکورہ ۴۵ ممالک میں ۲۰۰۰ء کی مردم شماری کے مطابق، کل آبادی ایک ارب ۱۶ کروڑ اور ۴۴ لاکھ ہے اور ان میں سے ایک ارب ۸۷ لاکھ اور ۹۹ ہزار مسلمان، ہیں (۸۵/۵۶ فیصد)۔ مذکورہ ۴۵ ممالک میں سے ۴۲ ممالک اسلامی کانفرنس تنظیم کے اراکین ہیں اور قزاقستان، ازبکستان اور اریتر ہ اس خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود اسلامی کانفرنس تنظیم کے رکن نہیں ہیں۔ گوشوارہ نمبر (۱) کے مطابق ۲۰۰۰ء میں دنیا کے ممالک کی ۱۹/۶۴ فیصد آبادی مذکورہ ۴۵ ممالک میں تھی اور ان کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اور یہ ممالک بے دین عیسائیوں کی آبادی والے ممالک کے بعد تیسرے نمبر پر تھے۔[۲]

۱۔ مجتبیٰ امیری (۱۹۶۸ء) تمدنوں کے تصادم کا نظریہ ہانٹنگٹن اور اس کی تنقید کرنے والے۔ ترجمہ: مجتبیٰ امیری، تہران دفتر مطالعات سیاسی و بین الاقوامی۔

۲۔ اس مقالہ کے اعداد و شمار اور گوشوارے درج ذیل منابع سے حاصل کئے گئے ہیں: human development report, 1999, published for the united nations development programme new york oxford university press, ''عالمی ثقافت کی رپورٹ'' ثقافت خلاقیت و بازار۔ عالمی ثقافت کی رپورٹ (۱۹۹۸) تہران نیشنیل کمیشن یونیسکو تہران the world factbook 2002۔ http www,odic fields2119 html علامہ طباطبائی یونیورسٹی، علوم ارتباطات کے ڈاکٹریٹ کے دروس کا خلاصہ اور امام صادق یونیورسٹی کے ڈاکٹریٹ کے ثقافت و ارتباطات کے دروس

گوشوارہ نمبر(۱): دنیا کے مختلف ممالک میں ادیان کا رتبہ، آبادی اور شرح ۲۰۰۰ء میں

رتبہ	آبادی (لاکھوں میں)	شرح
عیسائیوں کی آبادی	۱۹۰۹/۴ لاکھ	۳۳/۲ ٪
بے دینوں کی آبادی	۱۲۷۱/۵ لاکھ	۲۱/۲۴ ٪
مسلمانوں کی آبادی	۱۱۶۴/۴ لاکھ	۱۹/۶۴ ٪
ہندوؤں کی آبادی	۱۰۱۶/۴ لاکھ	۱۷/۴ ٪
بدھسٹوں کی آبادی	۴۰۰/۶ لاکھ	۶/۷۵ ٪
کفار کی آبادی	۱۶۰/۵ لاکھ	۲/۷۰ ٪
یہودیوں کی آبادی	۵/۹ لاکھ	۰/۱ ٪

تیسری تعریف:

عالم اسلام کی سب سے حقیقی عملی تعریف عبارت ہے: ''مسلمانوں کی جائے رہائش کو مدنظر رکھے بغیر ان کا اجماع۔'' اس تعریف کی یہ خصوصیت ہے کہ بڑی آبادی والے ممالک میں مسلمانوں کی اقلیت بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ (جیسے ہندوستان میں رہائش پذیر ۱۱ کروڑ مسلمان یا چین میں رہنے والے دو کروڑ اور تیس لاکھ مسلمان)

تحقیقات بتاتے ہیں کہ مسلمان دنیا کے ۹۹ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں دنیائے معاصر کی یہ حالت ہے کہ اس کے ۴۱ فیصد ممالک میں مسلمانوں کی ممکنہ آبادی تقریباً صفر ہے اور ۵۱ فیصد ممالک میں، کہ وہی ۹۹ ممالک ہیں، ان میں مسلمانوں کی آبادی ایک ارب، ۲ کروڑ، ۳۷ لاکھ ۲۵ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ رتبہ کے لحاظ سے یہ آبادی، عیسائیوں اور بے دینوں کی آبادی کے بعد تیسرے نمبر پر ہے۔ (بے دینوں کے بارے میں بعد میں وضاحت کی جائے گی)

گوشوارہ نمبر(۲)، ۲۰۰۰ء میں مختلف ادیان کا رتبہ اور ان کا پھیلاؤ

رتبہ	ملکوں میں پھیلے ہیں	ملین افراد	شرح
۱۔عیسائی	۱۵۱	۱۷۹۱/۹۶	۳۰/۱٪
۲۔بے دین	۱۰	۱۲۵۷/۱۴	۲۱/۱٪
۳۔مسلمان	۹۹	۱۲۳۷/۲۵	۲۰/۸٪

۴۔ھندو	۲۲	۶/۹۹	۱۵/۳۹۰٪
۵۔بودھائی، کنفیوشس اور شینتو	۲۱	۵۰۵/۱۹	۸/۵٪
۶۔کفار	۵۵	۲۱۳/۲۱	۳/۶٪
۷۔یہودی	۲۶	۲۶/۹۲	۰/۵٪
۸۔زرتشی	۳	۶/۰۹	۰/۱٪

جیسا کہ گوشوارہ نمبر۲ میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ عیسائی، مسلمانوں کی نسبت زیادہ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں (مسلمان ۹۹ ممالک میں اور عیسائی ۱۵۱ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں)۔شاید اس امر کا سبب، براعظم افریقہ ،ایشیا اور جنوبی امریکہ میں آج کل رونما ہونے والے واقعات ہیں۔

دنیائے معاصر میں، تین ابراھیمی دینوں کے علاوہ، جو مجموعی طور پر کرہ زمین کی تقریباً نصف آبادی پر مشتمل ہیں، ۲۳/۸ فیصد آبادی کو ان ادیان کا اعتقاد رکھنے والے تشکیل دیتے ہیں، جو دین شناسوں کی تقسیم بندی میں فلسفی ادیان کے نام سے مشہور ہیں۔(ھندومت، بدھ مت، کنفیوشیزم اور شینتو ازم ازم) [1] ۳/۶ فیصد آبادی کافروں پر مشتمل ہے (کافروں کے لئے دین کی اصطلاح کا استعمال سورہ کافرون کی آیت نمبر۱ اور ۶ میں ہوا ہے) جو دنیا کے ۵۵ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں اور حقیقت میں یہ لوگ ابتدائی ادیان کے پیرو شمار ہوتے ہیں۔زرتشتی، دنیا کی آبادی میں صرف ۰/۱ فیصد پر مشتمل ہیں اور یہ تین ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ان ادیان کے پیرووں کے علاوہ کرہ زمین پر ۲/۱ فیصد ان لوگوں کی آبادی ہی، جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ مذکورہ ادیان کے دوگروہوں یعنی ابراھیمی (خاص کر عیسائی) اور فلسفی ادیان سے تعلق رکھتے ہیں اور بیسویں صدی کی دنیا میں، اجتماعی، سیاسی تبدیلیوں سے متاثر ہو کر سیکولر یا بے دین شمار ہوتے ہیں۔ان لوگوں کی آبادی عیسائیوں کے بعد دوسرے نمبر پر ہے اور ایک ارب ۲۵ کروڑ اکتھر لاکھ اور چالیس ہزار افراد پر مشتمل ہیں۔لیکن ۱۲۵/۷۱ ملین افراد کی متوسط تعداد کے پیش نظر پہلے نمبر پر ہیں اور دنیا کے دس ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ان ممالک میں سرفہرست۔چین ہے کہ اس کے باشندوں کی ۸۶/۴ فیصد آبادی بے دین کہی گئی ہے۔امریکہ ۴۱/۲ فی صد، جرمنی ۲۶/۳ فی صد اور ہالینڈ ۳۶/۷ فی صد والے وہ ممالک ہیں جن میں ۵ ملین سے ایک ارب اور ۹۲ ملین تک افراد بے دین شمار ہوتے ہیں۔

تیسری تعریف میں اہم نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ آبادی کس قدر دینی اکثریت کی مہمان اور اقلیت کی میزبان ہے۔دوسرے الفاظ میں ان کی اقلیت میں نہ ہونے کی کیا کیفیت ہے؟

۱۔حسین توفیقی (۲۰۰۲ء) ''آشنائی با ادیان بزرگ'' تہران، سازمان مطالعہ و تدوین کتب علوم انسانی دانشگاہ ہا۔

۲۰۰۰ء میں ۸۱/۲۸ فیصد مسلمان ایسے ممالک میں زندگی بسر کرتے تھے، جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ حقیقت میں دنیا کے ۱۸/۵۲ فیصد مسلمان ایسے علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں جہاں پر وہ دینی اقلیت شمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۸/۸۹ فیصد مسلمان ہندو اکثریت میں ہیں، ۵/۲۵ فیصد عیسائی اکثریت میں، ۱/۸۵ فیصد بے دینوں کی اکثریت میں اور ۲/۷۱ فیصد مسلمان کفار کی اکثریت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

دوسرے ادیان کے حالات کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ھندوؤں کے دوسرے ادیان کی نسبت بہتر حالت میں ہونے اور اقلیت میں قرار نہ پانے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے ۹۵/۱۵ فیصد لوگ ایسے ملک میں زندگی کرتے ہیں جس کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے۔

گوشوارہ نمبر ۳ ۲۰۰۰ء میں مختلف ادیان کے اقلیت میں قرار نہ پانے کے مظاہر

ادیان	اقلیت میں نہ ہونے کی شرح	اکثریت	اکثریت میں ان کے ہم دین
۱۔ ہندو	۹۵/۱۵	۸۳	مسلمان
۲۔ عیسائی	۸۹/۶۰	۸۹	مسلمان
۳۔ بے دین	۸۷/۳۸	۲	عیسائی
۴۔ مسلمان	۸۱/۸۴	۴۵	ہندو
۵۔ بدھسٹ	۶۶/۵۹	۱۰	بے دین
۶۔ کافر	۴۶/۵۲	۱۶	عیسائی
۷۔ یہودی	۱۷/۹۲	۱	عیسائی

یہ گوشوارہ اس امر کی حکایت کرتا ہے کہ نسبت کے لحاظ سے اقلیت میں نہ ہونے کی نظر سے ایک طرف تقریباً ۸۷ فیصد دنیا کے عیسائی ایسے ممالک میں زندگی کرتے ہیں جن کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل ہے اور دوسری طرف اکثر یہودی، کفار اور بے دین بھی ایسے ممالک میں زندگی کرتے ہیں جن کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ نیز عیسائیوں کی سب سے زیادہ اقلیت ایسے ممالک میں زندگی بسر کرتی ہے جن کی زیادہ اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

مختلف ادیان کی آبادی کا مستقبل

تحقیقات کے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ، مستقبل میں دنیا میں مسلمانوں کی آبادی (گوشوارہ نمبر۳ کے مطابق) میں، دوسرے ادیان کی نسبت زیادہ تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

۲۰۰۰ء کی تحقیقات کے مطابق دنیا کی آبادی ۵ ارب ۹۴ کروڑ ۴۰ لاکھ ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ ۲۰۲۵ء میں یہ آبادی ۷ ارب ۷۷ کروڑ ۲۰ لاکھ (یعنی ۲۰۰۰ء کے ۱/۳ گنا) تک اور ۲۰۵۰ء میں ۹ ارب ۲ کرور اور ۶۰ لاکھ (یعنی ۲۰۰۰ء کے ۱/۵ گنا) تک پہنچ جائے گی۔

اگر ہم دنیا کے مختلف ممالک میں ادیان کا حصہ ۲۰۰۰ء کی تحقیق کو بنیاد پر قرار دیں اور ہر ملک کی آبادی میں تبدیلی کو اس ملک کے مختلف پیروان ادیان کی آبادی کے مشابہ اور ثابت فرض کریں تو گوشوارہ نمبر ۴ کے مطابق، توقع کی جاسکتی ہے کہ آئندہ پچاس سال کے دوران آبادی میں مسلمانوں کا حصہ دوسرے ادیان کی نسبت زیادہ ہوگا۔

گوشوارہ نمبر۴: ۱۹۷۵ء سے ۲۰۵۰ء تک مختلف ادیان کی آبادی میں متوقع تبدیلیاں

ادیان/سال	۱۹۷۵	۲۰۰۰	۲۰۱۵	۲۰۲۵	۲۰۵۰
عیسائی	۳۳	۳۰/۱	۲۹/۱	۲۹/۱	۲۹/۳
مسلمان	۱۶/۹	۲۰/۸	۲۳	۲۴	۲۶/۵
بدھیسٹ	۹/۱	۸/۵	۷/۸	۷/۴	۶/۴
یہودی	۰/۵	۰/۵	۰/۴	۰/۵	۰/۴
کافر	۲/۸	۳/۶	۳/۶	۴/۲	۵
ھندو	۱۴/۲	۱۵/۳	۱۵/۳	۱۶	۱۶/۵
بے دین	۲۳/۴	۲۱/۱	۲۱/۱	۱۸/۷	۱۵/۸
زرتشتی	۰/۱	۰/۱	۰/۱	۰/۱	۰/۱

ادیان کی آبادی میں ماضی اور مستقبل کے اندر جمعیت کی تبدیلی میں جو عدم مشابہت پائی جاتی ہے اس

کے دو جبری اور اختیاری عوامل ہیں۔شاید بدھسٹوں کی بے دینی میں تبدیل ہونا جبری تبدیلی کے دائرہ میں آتا ہے (ماؤزے تنگ کے زمانہ میں کمیونسٹوں کی حکمرانی کی حالت کی وجہ سے)اور مسیحیوں کا بے دینوں میں تبدیل ہونا اختیاری تبدیلی کے دائرہ میں آتا ہے(لیبرل سرمایہ دارانہ نظام میں سیکولرزم کے پھیلاؤ پر منتہی ہونے کی وجہ سے)

چین میں ماؤازم کے خاتمہ اور مستقبل کی تبدیلیوں کے پیش نظر کم ازکم اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دین کی طرف پلٹنا۔حتی اسی حد تک کہ سنٹرل ایشیاء کے مسلمان مما لک میں بعض اسلامی احکام کے نفاذ کے سلسلہ رونما ہوا۔قابل توقع ہے۔دوسری جانب سے عیسائیت کے دائرہ میں بھی دین کی طرف رجحان کے سلسلہ میں بعض تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور یہ وہی چیز ہے جسے ''ہنٹنگٹن'' نے ''تمدنوں کے تصادم'' میں پیش کیا ہے اور ''جارج ویگل'' جیسے دانشوروں نے دنیا کے غیر مادی ہونے کے سلسلہ میں کہا ہے کہ دنیا کا غیر مادی (یعنی مذہبی) ہونا ،بیسویں صدی کی زندگی کے آواخر کے نمایاں حقائق میں سے ہے۔[۱]

ہنٹگٹن معتقد ہے کہ سوویت یونین کے زوال اور سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد انسان کی ماھیت میں ایک قسم کا خلاء پیدا ہوا ہے کہ،اس خلاء کو پر کرنے کے سلسلہ میں تمدنی خودآ گاہی اور حیات مذہبی کے تجدد نے ایک وسیلہ کے عنوان سے رشد و بالیدگی اختیار کی ہے۔[۲]

''ہنٹنگٹن''اور''فوکویاما'' کے نظریات کے مجموعہ سے یہ نکتہ حاصل ہوسکتا ہے کہ ادیان کی آبادی کے لحاظ سے تبدیلیاں آئندہ ۵۰ سال کے دوران قابل توجہ مظہر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ تین تعریفوں میں سے تیسری تعریف (مسلمان اکثریت والے مما لک) مختلف ادیان کے درمیان موازنہ کرنے کے لئے زیادہ منطقی معیار ہے۔مستقبل کے ۵۰ سال کے دوران اکثریت کے حصہ کے ثابت رہنے کے فرض کے پیش نظر،دنیا کے مما لک میں آبادی کی تبدیلیوں کا جائزہ میں اکثریت کے دین کی بنیاد پر گوشوارہ نمبر ۵ میں لیا جاسکتا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۵: مختلف ادیان کی اکثریت والے دنیا کے مما لک کی آبادی میں ۱۹۷۵ء سے ۲۰۵۰ء تک رونما ہونے والی تبدیلیاں

۱۔امیری،۱۳۷۴،ص ۵۱

۲۔امیری،۱۳۷۴،ص ۲۲

ادیان/سال	۱۹۷۵	۲۰۰۰	۲۰۱۵	۲۰۲۵	۲۰۵۰
عیسائی اکثریت	۳۳	۳۳/۲	۳۰/۷۶	۳۰/۸۸	۳۱/۱۷
بے دین اکثریت	۲۳/۳۸	۲۱/۴۴	۱۹/۸۳	۱۸/۸۲	۱۵/۵۳
مسلمان اکثریت	۱۵/۵۹	۱۹/۶۴	۲۲/۰۸	۲۳/۲۰	۲۵/۹۷
ھندو اکثریت	۱۵/۹۱	۱۷/۴	۱۷/۶۷	۱۸/۰۱	۱۷/۵۳
بدھسٹ اکثریت	۷/۳۳	۶/۷۵	۶/۳۴	۵/۹۴	۵/۲۰
کفار اکثریت	۲/۰۲	۲/۷	۳/۱۷	۳	۳/۴۶
یہودی اکثریت	۰/۰۹	۱/۰	۱/۰	۰/۱۲	۰/۱۲

اس گوشوارہ میں واضح طور پر عیاں ہے کہ اگلے پچاس برسوں کے دوران مسلمان اکثریت والے ممالک کی آبادی، عالم مسیحت کے برخلاف، جو کمی سے دوچار ہے، شدّت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ حقیقت میں اگر مذکورہ ممالک کے بارے میں ۲۰۰۰ء میں ۱۰۰ فرض کریں، تو یہ مظہر عیسائی اکثریت والے ممالک میں ۲۰۵۰ء میں ۱۴۵ اور مسلمان اکثریت والے ممالک میں ۲۰۱ میں تبدیل ہوگا۔

تمدّنوں میں دین کا حصہ اور اسلام کا مقام

''سیموئل ہنٹنگٹن''، امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر ہے۔ وہ تمدن کے تشکیل دینے کے عناصر میں سے دین کے لئے ایک خاص مقام کا قائل ہے اور لکھتا ہے: تہذیبیں، تاریخ، زبان، ثقافت، سنت اور سب سے اہم مذہب کے ذریعہ ایک دوسرے سے متماز ہو تی ہیں۔ مختلف تمدنوں سے وابستہ انسان، خدا اور انسان، فرد و گروہ، عوام اور حکومت، والدین اور فرزندوں اور میاں بیوی کے درمیان روابط کے بارے میں میں مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ اسی طرح، حقوق اور ذمہ داریوں، آزادی و اختیار، مساوات اور سلسلہ مراتب کی نسبی اہمیت کے بارے میں ان کے نظریہ میں فرق ہے۔ یہ تفاوت صدیوں کے دوران پیدا ہوئے ہیں اور جلدی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ اختلافات سیاسی نظریات اور سیاسی نظاموں کے اختلافات کی نسبت زیادہ بنیادی ہیں۔'' [1]

۱۔ امیری ۱۳۴۷، ص ۴۹

''ہنٹنگٹن'' دوسرے ثقافتی عناصر کے مقابل میں مذہب کی محکم وآہنی خصلت کے بارے میں ایک دلچسپ مثال پیش کر کے آئیڈیالوجی کے مقابل انعطاف کو اس مثال کے ذریعہ بیان کرتا ہے کہ گزشتہ کل کا ایک کمیونسٹ آج کا ڈیموکریٹ بن سکتا ہے اور اقتصادی لحاظ سے ایک دولتمند ایک مفلس اور فقیر میں تبدیل ہوسکتا ہے ۔لیکن ایک آذری ،ارمنی نہیں بن سکتا ہے ۔وہ مزید کہتا ہے کہ آئیڈیولوجی اور طبقاتی جنگوں میں ،بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ آپ کس طرف ہیں؟ جبکہ تمدنوں کے ٹکراؤ میں سوال یہ ہے کہ تم کون ہو؟ پہلے سوال کے جواب میں جہت کو منتخب کیا جاسکتا ہے اور یہاں تک اس کو تبدیل کیا جاسکتا ہے ،جبکہ دوسرے سوال کا جواب ناقابل تغیر ہے ۔مذہب،قومیت سے بھی زیادہ افراد کو متماز کرتا ہے ۔ایک آدمی نصف فرانسوی اور نصف عرب ہوسکتا ہے یہاں تک کہ ڈبل نیشنلٹی کا مالک بن سکتا ہے،لیکن نصف عیسائی اور نصف مسلمان ہونا بہت مشکل ہے۔[1]

''ہنٹنگٹن''،عالم اسلام کی ایک شگفتہ عالم کی حیثیت سے توصیف کرتا ہے اور اس شگفتگی کو دنیا میں ناپائداری کے عوامل میں سے ایک عامل اور تمدنوں کے تصادم کا مقدمہ جانتا ہے۔وہ تمدنوں کے تصادم کے سلسلہ میں تشکیل پانے والے مسائل میں سے ایک کے بارے میں لکھتا ہے:''ناپائداری کے عوامل میں سے ایک اور عامل کا سرچشمہ عالم اسلام کی شگفتگی ہے۔۱۹۷۰ء کی دہائی کے آغاز میں اسلام کی تجدید حیات کا آغاز ہوا اور اس نے تمام اسلامی ممالک کو متاثر کیا۔اسلامی تجدید حیات نے سیاستوں میں تبدیلی،حکومتوں کے برتاؤ،رسومات اور لوگوں کے نظریات میں خود کو نمایاں کیا۔''

''ہنٹنگٹن''،اسلام کے احیاء کو ناکامیوں،جدیدیت سے پیدا ہونے والے مشکلوں،جمعیت کی افزائش سے پیدا ہونے والے سماجی تغیر،شہریت اور اسی طرح (اپنی بنیادی اصالتوں سے رابطہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے)اپنے آپ سے بے خبری کا ردعمل سمجھتا ہے۔وہ احیائے اسلام میں اصول پرستی کے رول کو بہت چھوٹا رول جانتا ہے اور اس کی توجہ زیادہ تر اسلام کی تجدید حیات کی کلی ماہیت سے مربوط ہے ۔وہ اس سلسلہ میں لکھتا ہے:''میرے اعتقاد کے مطابق ،مشکل،چند اصول پرست حکومتوں کا وجود نہیں ہے، بلکہ مشکل وہ اصول پرست افراد ہیں جو تمام اسلامی معاشروں میں عملی طور پر حکومت مخالف طاقت کو تشکیل دیتے ہیں،یہ حکومتیں جو اکثر مطلق العنان،ظالم،فاسد اور بہت سے مواقع پر غیر قانونی بھی ہیں۔''[2]

۱۔امیری،۱۳۷۴،ص۵۲۔۵۳

۲۔امیری،۱۳۷۴،ص۱۱۵

''ہنٹنگٹن'' کا نظریہ اکیسویں صدی کے آغاز میں دین کی طرف توجہ بڑھنے کے ایک عامل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کی تمدن کی تعریف میں، دین کا ایک خصوصی مقام ہے جبکہ دوسروں کی نظروں میں یہ تعبیر اس مفہوم میں کم تر مشاہدہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ ''الوین ٹیفلر'' نظریہ ''ہنٹنگٹن'' کو مسترد کرتے ہوئے تمدن کی تعریف میں لکھتا ہے: ''تمدن زندگی کے اس طریقہ پر اطلاق ہوتا ہے جو ایک خاص نظام کے تحت ثروت پیدا کرنے سے مربوط ہے، جیسے کھیتی باڑی، صنعت اور آج کل کا اطلاعات پر مبنی نظام۔ [1]

سید حسین نصر، امریکہ میں اسلام شناسی کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے ''ہنٹنگٹن'' کے مقالہ کی غیر عربی معاشرے میں ایک تقدیر ساز اقدام کے طور پر توصیف کی ہے، اور اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: ''مذکورہ مقالہ مستقبل کے دنیا کے بارے میں صرف ایک علمی نظریہ نہیں ہے بلکہ ایک حکمت عملی ہے۔'' [2]

اس کا اعتقاد ہے کہ اگر چہ عصر جدید کی مغربی دنیا میں علوم سیاسی کی بحثوں میں تمدنی مفہوم کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی لیکن ہنٹنگٹن کے مقالہ نے اسے علوم سیاسی کے جدید مفاہیم کے قالب میں زندہ کر دیا ہے۔ [3]

تمدنوں میں ادیان کے درمیان ترقی وتنزّل

کیا مستقبل میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ، عالم اسلام کے لئے کوئی امتیاز ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت والے ممالک میں آبادی میں نمایاں اضافہ مذکورہ ممالک میں حاملگی کی شرح زیادہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ یعنی ۱۹۷۵ء میں مسلمان اکثریت والے ممالک میں ہر عورت کی متوسط حاملگی ۶/۳۹ تھی جبکہ دنیا کے دوسرے ادیان میں مذکورہ نسبت ۳۶/۴ تھی۔ اگر ہم تازہ متولد بچوں کی موت وفوت کی شرح کو مدنظر رکھیں تو نتیجہ آبادی کے اضافہ کی وہ شرح ہے جو ۱۹۷۵ء میں مسلمان اکثریت والے ممالک میں ۲/۸ تھی اور دوسرے ادیان کی شرح ۱/۵ تھی۔

۲۰۰۰ء میں مسلمان عورتوں کی حاملگی کی شرح ۴۴/۷ تک کم ہوئی، لیکن پھر بھی مسلمان آبادی کے لحاظ سے اپنے دوسرے نمبر پر باقی رہے۔ اُس سال، سب سے زیادہ حاملگی کفار کی اکثریت والے ممالک میں (۵/۷) تھی اور سب سے کم حاملگی بے دین آبادی والے ممالک میں (۱/۵) تھی (مسلمانوں کی اکثریت کے ساتھ دوسرا رتبہ نیز تیسرے رتبہ اور کے بعد بالترتیب ھندو، بدھسٹ، یہودی اور عیسائی تھے)

۱۔ ٹیفلر ۱۳۷۴، ص/۱۸۸

۲۔ امیری ۱۳۷۴، ص/۱۲۱

۳۔ امیری ۱۳۷۴، ص/۱۲۴

مندرجہ ذیل گوشوارہ میں واضح کیا گیا ہے کہ مختلف ادیان میں سن وسال کے مطابق آبادی متفاوت اور تغیر وتبدل کی حالت میں ہے

ادیان	۱۹۹۹ میں متوسط		۲۰۱۵ میں متوسط	
	۱۵ سال تک	۶۰ سال سے اوپر	۱۵ سال تک	۶۰ سال سے اوپر
ا۔ مسلمان	۳۸/۶	۳/۶	۳۲/۴	۴/۹
۲۔ مسیحی	۲۸/۶	۸/۹	۲۳/۹	۳/۱
۳۔ یہودی	۲۸/۴	۹/۹	۲۴/۳	۱۱/۵
۴۔ بودائیست	۳۲/۵	۵/۹	۲۶/۶	۸/۱
۵۔ ہندوئیست	۳۳/۷	۴/۹	۲۸/۴	۶/۴
۶۔ آنیمیست	۴۴/۵	۳/۲	۴۱/۶	۳/۴
۷۔ بی دین	۲۱/۱	۸/۶	۱۶/۷	۱۱/۴

۲۰۰۰ء میں کفار جوانوں کی آبادی سب سے کم اور مسلمان جوانوں کی آبادی سب سے زیادہ تھی اور دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں میں بوڑھوں کی آبادی سب سے زیادہ تھی اور کفار ومسلمان میں بوڑھوں کی آبادی سب سے کم تھی۔ ۲۰۱۵ء میں کفار کے علاوہ تمام ادیان میں جوانوں کی آبادی تقریباً ایک نسبت سے کم ہوگی اور عیسائیوں، یہودیوں اور بے دینوں کی آبادی میں بوڑھوں میں شدت کے اضافہ ہوگا۔

ہم نے کہا کہ ''ہننگٹن'' معتقد ہے کہ رشد جمعیت کے علاوہ شہری آبادی میں اضافہ کے رجحان اورنئی تعمیرات اور اپنے آپ سے بے خبر ہونے سے ایجاد شدہ نا اُمیدی و مایوسی، حالیہ دہائیوں کے دوران اسلام کے زندہ ہونے کے عوامل میں سے ہیں۔

اقوام متحدہ کے اعداد وشمار کے مطابق، ۱۹۷۵ء میں مسلمان اکثریت والے ۴۵ ممالک میں کویت میں ۸۳/۸ فی صد سب سے بڑی شہری آباد والا ملک اور بنگلہ دیش ۹/۸ فیصد سب سے کم ترین شہری آبادی والا ملک ہے۔ (۴۵ ممالک میں مذکورہ اوسط ۳۸/۹۸ فیصد تھی) یہ نسبتیں ۱۹۹۹ء میں اضافہ ہوئیں۔ اوسط ۵۲/۱۱ فیصد میں تبدیلی ہوا کویت ۹۷/۴ فیصد اور بنگلا دیش ۲۳/۹ فیصد شہری آبادی ہوئی۔ توقع کی جاتی ہے کہ ۲۰۱۵ء میں مذکورہ اوسط ۶۰/۴۲ فیصد ہوگا اور اس کا پھیلاؤ ۳۳/۹ سے ۹۸/۲ تک ہوگا۔

اس طرح جو اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی معاشروں کے مستقبل میں جوانوں کی گھنی آبادی کس قدر ترقی یافتہ زندگی بسر کرے گی؟

ترقی یافتگی کا مفہوم

دوسری عالمی جنگ کو بیس سال گزر چکے تھے، عالمی منصوبے جیسے مارشل منصوبہ، اس نظریہ کے پیش نظر کہ ترقی، اقتصادی بالیدگی کے مترادف ہے، ناکامی سے دوچار ہوئے اور ترقی کا مفہوم اس طرح چیلنج سے دوچار ہوا کہ ''دیکنسون'' نے لکھا: جو''ہر شخص ترقی کے بارے میں ایک قسم کی بات کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ترقی کا معنی کیا ہے؟ یقیناً اس لفظ کا معنی آسان نہیں ہے، بلکہ جو بھی اس کے بارے میں بات کرتا ہے، اس کا الگ معنی بیان کرتا ہے۔''[1]

انہی سالوں میں ابھی ترقی کے بارے میں غالب تصور، سرمایہ کی صحیح ترکیب و اندازہ کو حاصل کرنے کے بارے میں (خواہ بچت کے ذریعہ یا قومی سرمایہ گزاری سے) ترقی یافتہ ملکوں کے نقش قدم پر چلنا تھا۔[2] اس راہ میں اور ۱۹۶۰ء کی دہائی کے دوران تازہ آزاد ہوئے ممالک کو جذب کرنے کی رقابت کے دوران اس بچت کا حصہ بھی معین ہوا اور روسٹو (w w rostow) جیسے امریکہ کے مشہور اقتصاد دان نے کہا تھا: ''وہ ممالک جو دائمی ترقی حاصل کر سکیں''، ان ہی نظریات کو آگے بڑھاتے ہوئے، ریاضی کے نمونے بھی پیش کئے گئے۔ مثال کے طور پر معین ہوا کہ جو بھی ملک ۷ فیصد کے برابر ترقی حاصل کرنا چاہے، اسے اپنی قومی درآمد کے ۲۱ فیصد کی سرمایہ گزاری کرنی چاہیئے اب اگر اس کی بچت ۱۵ فیصد ہو تو باقی فیصد کو بیرونی لون سے پورا کرے یا نجی شعبہ میں خارجی سرمایہ گزاری کے امکان کو فراہم کرے۔[3]

اس طرح بچت اور داخلی سرمایہ گزاری، بیرونی زرمبادلہ، خارجی یا داخلی مہارت و مدیریت، ۱۹۶۰ء کی آخری دہائی تک پسماندہ ممالک کے لئے ترقی حاصل کرنے کے بنیادی عوامل شمار ہوتے تھے۔[4] ۱۹۷۰ء کی دہائی میں، ترقی کی اصطلاح کا معنی، صرف کلی اقتصادی ترقی کے رجحان سے جزئی تر مباحث، جیسے آمدنی کی تقسیم

۱۔ مائیکل تودارو۔ ۱۳۷۰، تیسری دنیا میں اقتصادی ترقی، جاول۔ ترجمہ ڈاکٹر غلام علی فرہادی۔ طبع پنجم، تہرانسازمان برنامہ و بودجہ، مرکز مدارک اقتصادی و اجتماعی۔

۲۔ تودارو، ۱۳۷۰، ص ۱۱۶۔

۳۔ تودارو ۱۳۷۰، ص ۱۲۱۔۱۲۲

۴۔ تودارو ۱۳۷۰، ص ۱۲۳

اور نابرابری کی طرف بھی مائل ہوا۔[۱]

۱۹۸۰ء کی دہائی میں اخلاقی قدریں انسانی ضرورت کے فرضیے بھی اقتصادی ترقی کے مکاتب میں داخل ہو گئے درحقیقت اس زمانہ میں ایران جیسے معاشرہ کا باور اس ضرب المثل کے مانند ''جو دانت دے گا وہی روٹی بھی دے گا'' ترقی یافتگی کے درجہ تک پہنچنے کا عامل سمجھا جانے لگا۔[۲]

یہ نظریہ اس بات کی حکایت کرتا ہے کہ اقتصادی و اجتماعی برابری عام تعلیم، قومی آزادی، تنظیموں کی تشکیل نو، سیاسی و اقتصادی شراکت، حقیقی ڈیموکریسی اور خود اعتمادی جیسی قدریں فقر کو جڑ سے اکھاڑنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی سطح کو بلند کر کے ترقی کے امکانات فراہم کر دیں گی۔

ہم جانتے ہیں کہ ترقی میں اقدار کے رول کی بحث ۱۹۸۰ء سے برسوں قبل اور انیسویں صدی کے آغاز میں ''ماکس وبر'' نے بھی پیش کی تھی۔ ''وبر'' نے مغربی سرمایہ داری کی تشکیل پانے میں مذہبی قدروں مثلاً پروٹسٹنزم کو ایک اہم عامل کے طور پر پیش کیا تھا۔ حقیقت میں ۱۹۶۰ء کی آخری دہائیوں تک ''روسٹو'' اور ''وبر'' کا بیان اور ترقی کے نظریات مشابہ تھے اور تمام نظریات بچت اور سرمایہ گزاری کی اسی فارمولہ پر ختم ہوتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ''وبر'' اقدار کے مظہر کو اس کا سرچشمہ جانتا تھا۔[۳]

۱۹۹۰ء کی دہائی کے آغاز میں ترقی کے سلسلہ میں اقدار کے رول کی بحث شدید تھی۔ جس شخص نے اس مقولہ کی طرف توجہ کی، وہ مائیکل ٹوڈارو (michael p todaro)، تھا جو اقوام متحدہ کی جمعیت کی سیاست سے مربوط کمیٹی کا ماہر اور نیویارک یونیورسٹی کا پروفسر تھا۔

ٹوڈارو نے ترقی کی پورے معاشرہ و اجتماعی نظام کے پے در پے بہتر و یا انسانی تر تکامل کے عنوان سے تعریف کی ہے۔ اس نے ترقی کے اندرونی معنی کو کم از کم تین بنیادی قدروں میں تقسیم کیا ہے: ۱۔ زندگی کی معاش ۲۔ خود اعتمادی ۳۔ غلامی کی قید سے رہائی۔[۴]

۱۔ تودارو ۱۳۷۰، ص ۲۱

۲۔ تودارو ۱۳۷۰، ص ۱۳۶

۳۔ ماکس وبر (۱۹۹۴ء) ''پروٹسٹانٹ اور روح سرمایہ داری'' ترجمہ عبدالکریم رشیدیان اور منوچہر کاشانی تہران، انتشارات علمی و فرہنگی ص ۱۰

عالم اسلام کی انسانی ترقی کا شاخص

اس طرح ترقی پانے کے معیار کا جائزہ لینے میں ،اقتصادی ثروت کو، ترقی پانے کے تنہا شاخص کے علاوہ، دوسرے عوامل کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے، یہاں تک کہ سرانجام اقوام متحدہ نے ،اقتصادی ثروت کے بجائے ،انسانی ثروت کو ہر ملک کی حقیقی ثروت شمار کیا ہے۔اس تبدیلی کو اقوام متحدہ سے مربوط ''آبادکاری کے پروگرام''(undh) سے موسوم ایک تنظیم کی انسانی وسعت (development human) نامی رپورٹ کے مقدمہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔اس مقدمہ میں آیا ہے:

''لوگ، یعنی مرد اور عورتیں، ہر ملک کی حقیقی ثروت ہیں۔ وسعت کا مقصد، ایسے شرائط ایجاد کرنا ہے، کہ لوگ ان میں، طولانی عمر اور صحت مند و تعمیری زندگی سے بہرہ مند ہوجائیں۔لیکن یہ سادہ اور بامعنی حقیقت ،مادی آرام و آسائش اور مالی ثروت حاصل کرنے کے چکر میں فراموش کردی ہے۔''

۱۹۹۰ء میں شائع ہونے والی، انسانی ترقی کی پہلی رپورٹ نے ''انسانوں'' کو پھر سے ترقی کے مرکز کے طور پر توجہ دینے میں مدد کی ۔اس رپورٹ کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ انسانی وسعت (development human) اقتصادی ترقی کی قراردادی ترقی کی نسبت وسیع تر مفہوم کی حامل ہے۔[1]

اور اس گزارش میں پہلی بار انسانی ترقی (hdi) کے نام سے ایک نئے شاخص کا استفادہ ہوا جو حسب ذیل تین شاخصوں پر مشتمل ہے: ۱۔ زندگی کی اُمید (طولانی عمر اور صحت وسلامتی کی علامت)

۲۔تعلیمی ترقی (علم ودانش کی سطح کی علامت)

۳۔ڈالر سے خریدنے کی قدرت کے مطابق اندرونی ناخالص پیداوار (شائستہ اور مناسب سطح زندگی کی علامت)۔[2]

ابتدائی سالوں کی رپورٹوں میں، مذکورہ شاخص کی یوں تعریف کی گئی تھی: کہ اگر ایک ملک کی آبادی کی اکثر زندگی ۸۵ سال ہو ،سو فیصد آبادی تعلیم یافتہ اور شرائط متوسط تعلیم یافتہ ۱۵سال (یعنی گریجویشن کے قریب) ہوں اور اوسطاً اقتصادی قدرت سالانہ ۴۰ ہزار ڈالر فی کس کے برابر ہو،تو وہ ملک انسانی وسعت کے لحاظ سے ایک نمبر کے برابر ہے ۔لیکن اگر ایک ملک میں، زندگی کی اُمید ۲۵ سال ہو اور پوری قوم ان پڑھ ہو اور سالانہ اقتصادی قدرت ۲۰۰ ڈالر فی کس ہو،تو ان کی انسانی وسعت صفر کے برابر ہوگی۔

۱۔انسانی ترقی کی رپورٹ (۱۹۹۵ء) تہران وزارت جہادسازندگی معاونت ترویج،ص۱/۔

۲۔انسانی ترقی کی رپورٹ (۱۹۹۵ء) تہران وزارت جہادسازندگی ،معاونت ترویج،ص۲

۲۰۰۳ء کی رپورٹ میں ۴۰ ہزار ڈالر کی رقم بدستور برقرار رہی ہے۔ لیکن تعلیم وتربیت (education) کے شاخص نے تغیّر پیدا کرکے اوسط سطح تعلیم کے بجائے، ابتدائی، مڈل اور اعلیٰ تعلیم کے دوروں میں داخلہ کی ترکیب سے استفادہ کیا گیا ہے۔[۱]

۲۰۰۳ء کی رپورٹ کے مطابق انسانی وسعت کا سب سے بالاتر شاخص ۰٫۹۴۲ رقم کا ناروے سے متعلق اور کم ترین شاخص ۰٫۲۷۵ رقم کا افریقی ملک سیرالئون سے متعلق تھا۔ (اقوام متحدہ نے انسانی ترقی کے شاخص کے مطابق دنیا کے ممالک کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: بالاترین ترقی ان ممالک سے مربوط ہے جن کا شاخص ۰٫۸۰۰ سے زیادہ ہو۔ درمیانی ترقی ان ممالک سے مربوط ہے جن کا شاخص ۰٫۷۹۹ سے کم اور ۰٫۵۰۰ سے زیادہ ہے اور سب سے نچلے درجہ کی ترقی ان ممالک سے مربوط ہے جن کا شاخص ۰٫۴۹۹ اور اس سے کم تر ہے۔)

اگر ہم تیسرے نمبر کی عملی تعریف کو مدنظر رکھیں، تو مذکورہ شاخص ایک مسلمان کے لئے ۰٫۵۹۵ کے برابر ہے دنیا کے یہودیوں کے لئے یہ شاخص ۰٫۸۲۶ کے برابر، عیسائیوں کے لئے ۰٫۷۷۰ کے برابر، بے دینوں اور بدھسٹ دونوں کے لئے ۰٫۷۵۲، زرتشوں کے لئے ۰٫۵۸۰، ھندؤں کے لئے ۰٫۵۷۶ اور کفار کے لئے ۰٫۴۸۹ کے برابر ہے۔

تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں پھیلے ہوئے یہودی، نہ صرف انسانی ترقی کے سب سے بلند شاخص کے مالک ہیں، بلکہ ان کا زیادہ حصہ بلند شاخص کے حالات میں زندگی بسر کرتا ہے (۶۶ فیصد) اور ان میں سے کوئی بھی ان کی وسعت کے شاخص والے علاقہ میں زندگی نہیں کرتا ہے۔ جبکہ دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے صرف ۲ فیصد مسلمان بلند ترقی والے حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں، ۶۱ فیصد متوسط ترقی میں اور ۳۷ فیصد نچلے درجہ کی ترقی والے شاخص کے حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

اگر ہم معیار کا پیمانہ مسلمانوں کی اکثریت آبادی والے ممالک کو تعریف نمبر ۲ کے مطابق قرار دیں تو ہم ۲۰۰۳ء کی رپورٹ سے، مذکورہ ۴۵ ممالک کے لئے ۰٫۱۷۸ کے معیار کے انحراف سے ۰٫۶۱۰ کا متوسط نکال سکتے ہیں۔ یہ شاخص اس کی علامت ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل ۴۵ ممالک باشندے انسانی ترقی کے پیش نظر، یہودیوں کے بعد (۰٫۸۹۶، بے دین (۰٫۸۰۵) عیسائی (۰٫۷۵۹) بدھسٹ (۰٫۶۷۴) اور ھندؤں کے

بعد (۰/۶۱۳) اور کفار سے پہلے (۰/۴۳۸) پر واقع ہیں۔

تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت والے ممالک شدید پسماندگی کے علاوہ دوسرے ادیان کی اکثریت والے ممالک کی نسبت سب سے زیادہ نابرابری سے دوچار ہیں اور اس لحاظ سے دنیا میں پہلے رتبہ پر قرار پائے ہیں، کیونکہ جس طرح دوسرے ممالک کی اختلاف کی شرح ۱۰ سے ۲۲ کے درمیان ہے اور مسلمانوں کے لئے یہ شرح ۲۹ ہے۔[۱]

حقیقت میں عالم اسلام دوسرے ادیان کے مقابلہ میں، انسانی ترقی کے پیش نظر (حفظان صحت اور علاج ومعالجہ، تعلیمی شرح، تعلیم یافتہ افراد کی سطح، قدرت خرید اور لوگوں کی اقتصادی توانائی کے لحاظ سے) شدیداً پسماندہ ہے۔ اسی طرح، مسلمانوں میں نابرابری، دوسرے ادیان کی نسبت زیادہ ہے۔

موجودہ اعداد وشمار کی تحقیقات میں مذکورہ پسماندگی کے بعض عوامل دکھائے جاتے ہیں۔

۱۔ شرح خواندگی کا عامل

مسلمانوں میں ان پڑھ ہونے کی شرح یہودیوں، عسائیوں، بے دینوں اور بدھسٹوں سے زیادہ ہے ۔ جبکہ صرف ۴ فیصد یہودی، ۱۱ فیصد عیسائی، ۱۵ فیصد بے دین اور ۲۲ فیصد بدھسٹ ان پڑھ ہیں۔ باقی ادیان کے ان پڑھ ہونے کی شرح زیادہ اور ان کے اختلاف کی شرح ۲۲/۴ ہے (یہ شرح بے دینوں میں ۹/۴ اور بدھسٹوں میں ۲۰/۴ ہے)۔ سطح تعلیم کے سلسلہ میں بھی پسماندگی پائی جاتی ہے۔ اوسطاً ایک یہودی نے ۱۰/۲ سال تعلیم پڑھی ہے ۔ یہ خصوصیت عیسائی کے لئے ۶/۶، بے دین کے لئے ۶/۱، بدھسٹ کے لئے ۵/۱، ہندو کے لئے ۲/۹ اور مسلمان کے لئے صرف ۲/۵ سال ہے۔

اسلامی ممالک اپنی قوموں کی تعلیم وتربیت کے لئے سب سے کم سرمایہ گزاری کرتے ہیں۔ حقیقت میں مسلمان اکثریت والے ممالک میں بجٹ کی تقسیم بندی دنیا کی حالت کے برعکس ہے۔ موجودہ دنیا میں، دنیا کے ممالک اپنے معاشرے میں اوسطاً جو بجٹ تعلیم وتربیت کے لئے GNP کی نسبت[۲]

۱۔ coefficient of variabili,

۲۔ اقومی ناخالص آمدنی (Gross national product,1 عبارت ہے ایک ملک میں مقیم افراد کی تمام داخلی وخارجی درآمد کی جمع جسے GNP کہا جاتا ہے۔

خرچ کرتے ہیں، وہ حفظان صحت اور علاج و معالجہ اور فوجی بجٹ سے زیادہ ہے۔ بالترتیب تعلیم وتربیت کا بجٹ ۴/۵۸ فیصد، حفظان صحت کا بجٹ ۳/۳۶ فیصد اور فوجی بجٹ ۲/۷۷ فیصد ہے۔ جبکہ اسلامی ممالک میں بالترتیب فوجی بجٹ ۴/۳۴ فیصد، تعلیم وتربیت کا بجٹ ۳/۸۹ فیصد اور حفظان صحت کا بجٹ ۲/۳۸ فیصد ہے۔ (البتہ ناخالص پیداوار (GNP) کی نسبت دنیا میں سب سے زیادہ فوجی بجٹ یہودیوں کا ہے اور ۸/۱ ہے، تعلیم وتربیت میں ان کا حصہ ۶/۷ اور حفظان صحت کا بجٹ بھی بالا یعنی ۶ فی صد کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک کے فوجی اخراجات اور ان کے تعلیم وتربیت اور حفظان صحت کے بجٹ کے درمیان اختلاف کی شرح ۱۱۸ ہے، یعنی فوجی اخراجات زیادہ ہیں۔ اس لحاظ سے دنیا کے ممالک میں حفظان صحت وعلاج و معالجہ کے بجٹ کے اختلاف کی شرح ۶۰ اور تعلیم وتربیت کی ۴۲ ہے۔

۲۔ عورتوں کی حالت کا عامل

بعض خصوصیات کے پیش نظر مسلمان عورتوں کی حالت دوسرے ادیان کی عورتوں کی نسبت ناگفتہ بہ ہے۔ مختلف ادیان میں کفار کے بعد سب سے زیادہ حاملگی مسلمان عورتوں میں ہے۔ مسلمان عورتوں کی اقتصاد میں شرکت، ہندوؤں کے بعد ماقبل کے رتبہ میں ہے (۴۸/۱ فیصد) مسلمان عورتوں کی سیاسی مشارکت بھی ہندوؤں کے بعد ماقبل کے آخر رتبہ میں ہے۔ (بے دین ممالک میں ۲۱/۸ فیصد پارلیمنٹ ممبر عورتیں ہیں، عیسائی ممالک میں یہ شرح ۱۵/۵ فیصد، یہودی ممالک میں ۱۲/۵ فیصد اور بدھسٹ ممالک میں ۱۱/۵ فیصد پارلیمنٹ ممبر عورتیں ہیں۔ مسلمان ممالک میں یہ نسبت ۷/۵ فیصد ہے۔)

اسلامی ممالک میں عورتوں کو انتخاب میں شرکت کرنے اور منتخب ہونے کا حق کافی دیر سے حاصل ہوا ہے۔ انھیں اوسطاً ۱۹۵۰ء سے رائے دینے اور ۱۹۵۱ء سے منتخب ہونے کا حق دیا گیا ہے کہ بالترتیب یہ حق انھیں دنیا کی نسبت ۵ اور ۶ سال تاخیر سے دیا گیا ہے۔

ان ممالک میں ان پڑھ عورتوں کی شرح بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ ۴۳ فیصد مسلمان عورتیں بالکل ان پڑھ ہیں۔ یہ نسبت یہودی عورتوں میں ۶ فیصد، عیسائی عورتوں میں ۱۳ فیصد بے دینوں میں ۱۷ فیصد اور بدھسٹوں میں یہ نسبت ۲۴ فیصد ہے۔

تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے تمام ادیان میں، مرد، عورتوں کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ ہیں، لیکن یہ نابرابری مسلمان عورتوں اور مردوں میں کفار کے بعد دوسرے ادیان کی نسبت زیادہ ہے۔ (یہودی اور بے دین مردوں کی

تعلیمی شرح عورتوں کے ۲/۱برابر ہے ،بدھسٹوں میں ۳/۱برابر ،عیسائیوں میں ۵/۱ برابر ، ھندؤں میں ۲ برابر ،مسلمانوں میں ۲/۱برابراور کفار میں یہ شرح ۳/۲برابر ہے)

۳۔(میڈیا)ذرائع ابلاغ کی حالت

MCI شاخص کے پیش نظر اسلامی معاشروں کے (میڈیا) ذرائع ابلاغ تک رسائی کا معادل ۵۷۰ ٪یعنی ادیان کے پانچویں رتبہ میں ہےاور دوسرے ادیان کی نسبت مسلمان، یہودیوں (۸۴۱ ٪)، بے دینوں (۲ ۸۰ ٪)،عیسائیوں (۷۳۶ ٪)اور بدھسٹوں (۷۵۶ ٪) کے بعدقرار پاتے ہیں۔[۱]

اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ہر ہزار افراد ایک دن میں ۵۰ نسخے روزنامے،۳/۶ کلو گرام نشریات،۲۴۹ ریڈیواور۱۸۰ ٹیلی ویزن تک رسائی رکھتے ہیں اور عیسائیوں کی یہی تعداد۴۳ ۵ ریڈیوتک دست رس رکھتی ہے۔

جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمیونیکیشن تک بھی مسلمانوں کی دست رس کی شرح نچلے درجہ پر ہے اسلامی مما لک میں مذکورہ ٹیکنالوجی (ICTI) کی شرح ۵۱۹ ٪ ہے۔یہودیوں کے لئے یہ شرح ۹۰۰ ٪، بے دینوں کے لئے ۷۵۸ ٪اور عیسائیوں کے لئے ۷۱۸ ٪ ہے۔[۲]

اعداد وشمار کے مطابق مسلمان اکثریت والے مما لک میں اوسطاً ہر ایک ہزار افراد کے اختیار میں تقریباً۸ ٹیلیفون لائینس ،۴موبائیل ،۳کمپیوٹر اور ۶/ ۱۵انٹرنیٹ ہیں ۔جبکہ ٹیلیفون،موبائیل ،کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا سب سے زیادہ استفادہ یہودی کرتے ہیں (ان کے پاس ٹیلیفون ،موبائیل اور انٹرنیٹ بالترتیب ۹/ ۴۵، ۶/ ۲۴اور ۹/ ۱۶۳ہے)

آخر میں یاد دہانی کی جاتی ہے کہ اعداد وشمار کومرتب کر کے نظر مسلمان مما لک کی پسماندگی کے اسباب وعلل جوپہلی بار پیش کئے جارہے ہیں ان کی طرف توجہ کی جانی چاہئے اور اسلامی مما لک اور مذاہب کے دانشوروں کو دعوت دی جانی چاہئے تا کہ علمی سنجیدگی سے،تعصب کے بغیرحتی الامکان دوسری حکومتوں میں مداخلت سے اجتناب

---

۱ ۔ MCI,1 ایک ایسا شاخص ہے جسے میں نے ۱۹۹۵ء میں مرتب کر کے ۲۰۰۰ء میں سنگاپور میں منعقدہ بین الاقوامی تحقیقی کانفرنس میں پیش کیا ہے ۔یہ شاخص ایک سے صفر تک ایک عدد ہے جس کا دنیا کے ۱۶۷ مما لک کا ۲۰۰۰ء میں اوسط ۶۴۸ ٪تھا۔(اسلامی مما لک ۵۷۰ ٪اور غیر اسلامی مما لک ۶۷۵ ٪تھا۔

۲۔شاخص ICTi بھی شاخص MCI کے ضمن میں مرتب ہوا ہے۔

کرتے ہوئے، اس دیرینہ پسماندگی کے اسرار کو فاش کریں۔ اس راہ میں ماکس وبر جیسے غیر مسلم پیشروؤں کے نظریات کے ضمن میں سید جمال الدین اسدآبادی جیسے مسلمان دانشوروں کے نظریات کا بھی مشترک طور پر مطالعہ کرنا چاہئے۔

وبر کا اعتقاد ہے کہ فاتح مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ عالمی عرفان وصوفی ازم نے اسلام کی بالقوہ زہدگرائی کو خالی کر دیا ہے اور ''جاگیردارانہ اخلاق'' کے لئے ضروری عناصر فراہم کئے ہیں۔ وہ غلامی رعیت پروری ،عورتوں کو حقیر جاننے، آزاد کارکن افراد کی عدم موجودگی اور عقلانی نظر کے فقدان اور اسی دنیا کی فکر کو مذکورہ جاگیردارانہ ذہنیت کا سبب جانتا ہے۔[۱]

لیکن مسلمان دانشوروں کا نظریہ وبر کی نسبت کافی عمیق اور حقیقت پسندانہ ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ لوگ کمزور ہوئے ہیں، کیونکہ تحریفات کی پے در پے ضربوں کے نتیجہ میں حقیقی اسلام تباہی سے دوچار ہوا۔ اور ابتدائی امت، انجام عمل کے سلسلہ میں سنجیدہ اور عقلانی تھی اور حقیقت میں یہ اسلامی حکومتیں، اسلامی مذاہب اور اسلامی معاشرے ہیں جو ابتدائی اسلام کی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔[۲]

۱۔ برایان ٹرنر (۲۰۰۰ء) ''ماکس وبر و اسلام'' ترجمہ سعید وصالی، تہران نشر مرکز، ص ۲۴۰۔۲۴۱

۲۔ ٹرنر، ۱۳۷۹، ص ۲۵۰۔ بنقل از Albert Hour(1962)Arabic Thought The Liberal Age,London

اکیسویں بین الاقوامی وحدت کانفرنس کا

اختتامی بیانیہ

ترجمہ: سید قلبی حسین رضوی

مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی (تقریب مذاہب اسلامی کی عالمی اسمبلی) کی اکیسویں بین الاقوامی کانفرنس ، ۲۷ سے ۲۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ مطابق ۴ سے ۶ مئی ۲۰۰۸ء تک اسلامی جمہوریہ ایران کے دارالخلافہ تہران میں منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس میں عالم اسلام کے مختلف ممالک کے سیکڑوں علماء اور دانشوروں نے شرکت کی ۔ اس کانفرنس کے مندوبین نے اسلامی منشور وحدت کے مسودہ اس کے بنیادی اصولوں ، پالیسی ، خطوط اور علمی منصوبوں پر بحث و گفتگو کی ۔

مفصل بحث ومباحثہ، گفتگواور تبادلہ خیالات کے بعد کنفرانس نے مندرجہ ذیل فیصلوں کا اعلان کیا:

۱)۔اس کانفرنس کے مندوبین اس امر کی تاکید کرتے ہیں کہ اسلامی اتحاد کی ایک خاص اہمیت ہے، جس کی قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں واضح طور پر بے حد تاکید کی گئی ہے اور اس کی فکری اور علمی بنیادوں کو واضح کر دیا گیا ہے اور علمی مباحث میں ہر قسم کے تعصب، کشمکش اور لڑائی جھگڑے کی مذمت کی گئی ہے۔

۲)۔کانفرنس کے مندوبین یقین رکھتے ہیں کہ انسانی زندگی کے لئے اسلام کے منصوبہ بند پروگرام کے

باوجود، عصر حاضر کے مختلف میدانوں میں مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات، پراکندگی اور پسماندگی قابل قبول نہیں ہے۔اس لئے اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ امت مسلمہ کے تمام دانشور، علماء اور ہمدرد، امت کو اس ناگفتہ بہ حالت سے نجات دلانے کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو نبھائیں تاکہ امت اسلامیہ کو بامقصد اتحاد کے پروگرام کے تحت ایک منصوبہ بند سطح تک پہنچایا جاسکے اور مختلف میدانوں میں اسلامی برادری کے اصول کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں اسلامی مذاہب کے درمیان تقریب کے مقصد کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

۳)۔کانفرنس ''اسلامی اتحاد کے منشور'' کے مسودہ کی اجمالی طور پر تائید کرتی ہے اور اس سلسلہ میں اسمبلی کے عمومی سیکریٹری کی طرف سے مختلف مذاہب کے دانشوروں اور علماء پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو اس مسودہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی اصلاحات، تجاویز کی تحقیق اور جانچ پڑتال کر کے مسودہ کا قطعی اور مفصل متن مرتب کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ یہ کمیٹی تمام دنیا کے مسلمان علماء، دانشوروں اور اساتذہ سے اس مسودہ پر دستخط کرنے کی درخواست کرے گی۔[۱]

۴)۔اس کانفرنس کے مندوبین مجمع جہانی تقریب مذاہب سے درخواست کرتے ہیں کہ اس منشور کے مختلف دفعات پر عملی جامہ پہنانے اور علماء و مسئولین کے ذریعہ انھیں نافذ اور نگرانی کرنے کی مسلسل کوشش کرے۔ اس کے علاوہ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں تذکر دینے اور اس کے نقائص و خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

۵)۔کانفرنس کے مندوبین تمام مفکرین، علماء، دانشوروں، معاشرہ شناسوں اور سیاستدانوں سے اس بارے میں تعاون کی اپیل کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں مکہ مکرمہ میں ۵ سے ۶ ذیقعدہ مطابق ۷ سے ۸ دسمبر ۲۰۰۵ء منعقد قائدین کی غیر معمولی کانفرنس کے دس سالہ منصوبہ کے منظور شدہ درج ذیل نکات کی یاد دہانی کراتے ہیں:

الف: مندوبین نے مختلف اسلامی مذاہب کے پیروؤں کے درمیان عمیق گفتگو اور ان کے اسلام کے صحیح ہونے کی تاکید کی اور خداوند متعال اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور ایمان کے دوسرے ارکان کے احترام کے قائل ہونے اور دین کے واضح مسائل کے منکر نہ ہونے والوں کے خلاف حکم کفر کے جائز ہونے خون بہانے یا ناموس و مال پر تجاوز کے حرام ہونے کی طرف توجہ دلائی۔

۱۔اب تک ساڑھے تین ہزار سے زیادہ اسلامی شخصیات نے اس مسودہ پر دستخط کر دیئے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

ب)۔اس کانفرنس کے مندوبین نے فتوی صادر کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے والوں کی طرف سے فتویٰ جاری کرنے کو دین کے قواعد اوراس کے ناقابل تغییر مسائل واحکام کے خلاف جانتے ہوئے اس کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ اس سلسلہ میں فتویٰ کے معین اصولوں کی پابندی کرنا ضروری ہے جو علماء کی طرف سے عمان میں جولائی ۲۰۰۵ء میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں طے پائے ہیں اور مکہ مکرمہ میں ۹ سے ۱۱ ۲۰۰۵ء تک منعقد علماء و دانشوروں کے مقدماتی سمینار میں اس کی تاکید کی گئی ہے اوراس امر کا محقق ہونا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اسے زندگی کے مختلف شعبوں کے فکری، معاشرتی، علمی، اقتصادی، قانونی اور تبلیغی امور میں عملی جامہ پہنایا جائے۔

۶)۔کانفرنس کے مندوبین کا اعتقاد ہے کہ اسلام کے مقدسات اور مسلمات کا احترام، خاص کر قرآن مجید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت، اس امت کا اہم حصہ شمار ہوتا ہے۔اس لئے ان میں سے کسی ایک کی، ہرصورت میں توہین جائز نہیں ہے اور یہ توہین تمام شریعتوں اور قوانین کے رو سے منافات رکھتی ہے اور تمام محافل، تنظیموں اور حکومتوں سے اس قسم کی حد شکنی اور بے احترامی کو روکنے کے لئے قوانین واحکام صادر و نافذ کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔

۷)۔کانفرنس کے مندوبین نے امت اسلامیہ کے تمام تعلیمی اداروں، انجمنوں اوران کے ذمہ داروں سے درخواست کی، کہ علمی توانائیوں خاص کر ایٹمی توانائی سے مصالحت آمیز استفادہ کرنے کے لئے ایک وسیع علمی تحریک کا آغاز کریں تاکہ امت اسلامیہ کو تمام شعبوں میں پسماندگی سے نجات دلائی جاسکے۔

۸)۔کانفرنس کے مندوبین نے اس امر کی تاکید کی، کہ تعلیم وتربیت کے پروگرام میں ضرورت کے مطابق اصلاح کی جانی چاہئے اور مسلمانوں کی موجودہ نسل کو مطلوبہ ثقافت کی تربیت کے لئے حسب ضرورت اطلاع رسانی کے منصوبے مرتب کئے جائیں۔جن میں اتحاد واخوت کے اصول اور تعمیری تعاون کے تمام میدانوں میں ترقی کرنے کی توانائی موجود ہو۔

۹)۔کانفرنس کے مندوبین نے ظالم صہیونیوں کے ذریعہ فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کی ساٹھویں سالگرہ پر تاکید کی کہ قدس شریف اور فلسطین کی تمام سرزمین کی آزادی اور تمام فلسطینی پناہ گزینوں کی اپنے وطن واپسی کے لئے

ضروری ہے کہ عالم اسلام اپنے تمام وسائل اور توانائیوں کو بروئے کار لائے تاکہ فلسطین کے پناہ گزیں اپنے وطن لوٹ کر اپنی قسمت کا خود فیصلہ کریں اس سلسلہ میں عالم اسلام کو اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ منظّم اور متحد پالیسی اپنانی چاہئے ۔اس کے علاوہ مندوبین نے دنیا کے تمام آزادی پسند لوگوں سے فلسطینی مظلوموں کے اس انسانی حق کی حمایت کرنے کی اپیل کی۔

۱۰)۔اس کانفرنس کے مندوبین کا اعتقاد ہے کہ ہم سب پر یہ فرض ہے کہ فلسطین ، لبنان ،عراق ، افغانستان ،سومالی وغیرہ میں امت اسلامیہ کو درپیش مشکلات میں صہیونی دشمنوں اور ظالم امریکہ کے تسلط سے اپنے مسلمان بھائیوں کو رہائی دلانے اور برادر کشی کو روکنے کے لئے ہمہ جہت اور وسیع پیانے پر آپس میں تعاون کریں نیز مسلمانوں کی ثقافت وتمدن ، اعتقادات اور ان کی اپنی ہستی کو درپیش چیلینجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مقاوت کو تقویت بخشیں۔

۱۱)۔اس کانفرنس کے مندوبین ،اسلامی انقلاب کے رہبر ،اسلامی جمہوریہ ایران کے ذمہ داروں اور مجمع جہانی تقریب مذاہب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ اسلامی امت کو نجات اور عزت وآبرو بخشنے کے سلسلے میں اپنی مخلصانہ کوششوں میں مسلسل مشغول ہیں۔

منشوراتحاداسلامی کامسودہ

ترجمہ: سیداحتشام عباس زیدی

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

" الحمد للّٰہ ربّ العالمین و الصلاۃ و السّلام علیٰ سید البشریۃ و مقتداھا محمّدٍ النّبی الامین و آلہ الطاھرین وصحبہ المیامینَ و من تبعھم باحسان الیٰ یوم الدّین "

اس امر پر ایمان رکھتے ہوئے کہ اسلام مسلمانوں کے پاس امانت الٰہی ہے اور اس کا اوراس کے مقدسات کا دفاع کرنا سب پر واجب ہے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اسلام ان تمام امور کی پابندی کی تاکید کرتا ہے جو مسلمانوں میں اتحاد اور بھائی چارے کا سبب بنتے ہیں، عاقلانہ گفتگو کی ثقافت کی رواج دیتے ہیں اور جن کے سبب مسلمانوں میں تعاون، یک جہتی اور ہمدردی کو فروغ ملتا ہے نیز اسلام کے اعلیٰ اہداف پورے ہوتے ہیں۔اسلام اور مسلمانوں کی ثقافت، اقتدار، مفادات، اور آزادی پر دشمنان اسلام عالمی سامراج اور صہیونیزم کے وسیع حملوں اوران کی جارحیت سے مقابلہ کے لیئے مسلمانوں کی تمام مادی و معنوی طاقتوں کو یکجا کرنے کی ضرورت کے پیش نظر اس منشور پر دست خط کرنے والے ہم علماء و

متفکرین، ماضی میں مکہ مکرمہ، تہران، امان، قاہرہ و.... میں علماء اسلام کی گران قدر کوششوں کو سراہتے ہوئے مندرجہ ذیل اصول پر اپنے ایمان و یقین کا اعلان کرتے ہیں اور امت مسلمہ کے لیئے ان کی پابندی ضروری قرار دیتے ہیں۔

اصول:

۱۔ دین اسلام دین خاتم اور انسان کی سعادت کا واحد راستہ ہے۔ مسلمان اس دین کے امانت دار ہیں لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اسلامی تعلیمات کو زندگی کے ہر شعبہ میں نافذ کریں، اس کے مقدسات کا دفاع کریں اور اس کے مفادات کو تمام مفادات پر مقدم رکھیں۔

۲۔ قرآن مجید اور سنت نبوی ﷺ اسلامی قانون سازی کے بنیادی مصدر ہیں۔ تمام اسلامی مذاہب قرآن و سنت نبوی کی حقانیت و حجیت پر یقین رکھتے ہیں اور دیگر منابع شریعت کا اعتبار بھی قرآن و سنت کے مطابق ہونے کی بنا پر ہے۔

۳۔ مندرجہ ذیل اصول وارکان پر ایمان مسلمان ہونے کا معیار ہے:

الف):۔ خدا کی وحدانیت پر یقین۔

ب):۔ رسول ﷺ کی نبوت و خاتمیت پر یقین اور یہ کہ آنحضرت ﷺ کی سنت دین کے بنیادی منابع میں سے ایک ہے۔

ج: قرآن کریم اور اس کے مفاہیم واحکام پر ایمان کہ وہ دین اسلام کا پہلا بنیادی منبع ہے۔

د):۔ دین کے مسلمہ و متفق علیہ اصول وارکان جیسے نماز، روزہ، زکات، حج و جہاد کا انکار نہ کرنا۔

ھ):۔ معاد پر ایمان۔

۴: حقیقی اسلام نے اسلامی منابع کے دائرے میں اصل اجتہاد کو تسلیم کرتے ہوئے فکری اختلاف کو قبول کیا ہے بنابراین مسلمانوں کے لیئے ضروری ہے کہ اجتہاد کو فطری امر تسلیم کرتے ہوئے ایک دوسرے کے نظریات کا احترام کریں۔

۵۔ اسلامی امت کا اتحاد اور مسلمانوں کے عام مصالح و مفادات کا تحفظ ایک اہم اصل ہے اور مسلمانوں میں اسلامی اخوت و برادری ہر طرح کے باہمی تعاون اور تک جہتی کی اساس شمار ہوتی ہے۔

نصب العین:

۶۔عالم اسلام کے علماء،متفکرین اور دانشوروں کے لیئے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل امور کو نصب العین بنائیں:

- آج کے اسلامی معاشروں کو صدر اسلام کی صورت حال سے نزدیک کرنے کی کوشش کی جاے تا کہ مسلمانوں میں دینی برادری، تعاون،تقوے اور چیلنجوں سے مقابلہ کرنے کے جذبات کو فروغ ملے ۔مسلمان ایک دوسرے کو حق وصبر کی تلقین کریں اور ان تمام چیزوں سے دوری اختیار کریں جو ان میں تفرقہ ،رسہ کشی اور کمزوری کا باعث ہوتے ہیں۔
- مسلمان اپنی زندگی میں اسلامی مذاہب کے ائمہ کی سیرت کو نمونہ عمل بنائیں اور اس کو آج کے پیروؤں کے درمیان رواج دینے کی کوشش کریں۔
- مسلمانوں میں اتحاد و یک جہتی کے جذبات کو اس حد تک فروغ دیا جاے کہ وہ ایک دوسرے کے فکری اختلافات کو تسلیم کریں اور اسے قانونی اجتہاد کا نتیجہ تسلیم کریں۔

۷۔ عالم اسلام کے علماء اور دانشوروں کے لیئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی بیداری کی تحریک کو استحکام پہنچائیں اور اسکی سر براہی کریں۔مسلمانوں کو ایک دوسرے سے آشنا کرنے کی غرض سے اسلامی مذاہب کے پیروؤں کے میل جول کو بڑھاوا دیں،دینی الفت،اور اسلامی اخوت کو اسلام کے ثابت ومشترکہ اصولوں کی اساس پر رائج کریں۔

تقریب مذاہب اسلامی:

۸۔اسلامی مذاہب کے پیروؤں کے درمیان قربت پیدا کرنا زندگی کے تمام میدانوں کو شامل ہے اور عقائد فقہ اخلاق،تہذیب وتاریخ سب پر محیط ہے

عمومی منصوبے:

۹۔تقریب مذاہب کے لیئے مذکورہ بالا امور کے علاوہ دیگر اصولوں پر عمل درآمد بھی ضروری ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

- مسلمانوں کے متفقہ امور پر مکمل تعاون کی ضرورت۔
- کلمہ اللہ کو بلند کرنے اور اسلامی احکام کے نفاذ کے لیئے تمام تر مادی ومعنوی وسایل سے استفادہ کرنا۔
- دشمنان اسلام کے مقابل خاص طور سے امت اسلامیہ کے اہم مسائل جیسے عراق وافغانستان و فلسطینی وغیرہ کے حل کے لیئے متحدہ اور متفقہ موقف اختیار کرنا۔
- مسلمانوں کو ایک دوسرے پر کفر وفسق و بدعت کا الزام لگانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ہم مسلمان جو اسلامی منابع کے دائرہ میں اجتہاد کی شرعی حیثیت پر یقین رکھتے ہیں، ہمیں اس اصل کے لوازم ونتائج کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ ہر چند دوسروں کا اجتہادی نظریہ ہماری نظر میں خطا ہو ہمیں اختلافات کے بارہ میں اپنے فیصلوں کو ایمان وکفر کے بجائے صحیح اور غیر صحیح میں تبدیل کرنا چاہیے۔ اسی طرح دوسروں کے قول یا رائے کی وجہ سے جو ہمارا گمان میں اصول دین سے افکار کے برابر ہے لیکن وہ اس بات کو قبول نہیں کرتے، ان پر کفر کا فتویٰ لگانا جائز نہیں ہے۔
- اسلام میں تعدد اجتہاد کو تسلیم کرتے ہوئے اختلافات سے محترم انداز سے پیش آنا چاہیے۔
- ایک دوسرے کے مقدسات کی بے حرمتی نہ کریں۔ جب اسلام نے دیگر ادیان کے ساتھ رواداری کا حکم دیا ہے اور مسلمانوں سے چاہتا ہے کہ دوسروں کے باطل فکر واعتقادی مقدسات کی بے حرمتی نہ کریں۔ تو ہمیں اسلامی مذاہب کے پیروؤں کے مقدسات کی بے حرمتی سے پرہیز کرتے ہوئے بدرجہ اولیٰ ایک دوسرے کے مقدسات کے احترام کا حکم دیتا ہے۔ اور اہل بیت رسول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے نیک کردار اصحاب کے احترام پر زور دیتا ہے۔

۷۔ کسی تنظیم یا حکومت کو لوگوں کی کمزوری اور ضرورت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو کسی خاص مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے، بلکہ مذکورہ اصولوں کے مطابق معتبر اسلامی مذاہب کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے پیروؤں کو مکمل حقوق دینا چاہیے۔

۸۔ شخصی احکام پر عمل کرنے میں ہر شخص کو آزادی ہونی چاہیے۔ فردی اور شخصی مسائل پر عمل کرنے میں ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے میں آزاد ہیں لیکن عام قوانین پر عمل کرنے

مین وہ ملک کے موجودہ قوانین کے تابع ہونگے۔

۹۔قرآن مجید نے چونکہ مسلمانوں کو حصول حقیقت کے لیئے شور وغوغا اور رعب و وحشت کے بغیر دوسروں سے صحت مند اور منطقی گفتگو کی دعوت دی ہے لہٰذا مسلمانوں پر بدرجہ اولیٰ واجب ہے کہ وہ انسانی آداب و اخلاق کی پابندی کرتے ہوئے گفتگو کے ذریعے اپنے اختلافات حل کریں اور اس راہ میں عملی اقدام کریں، نیز عملی پہلو سے زندگی مین تقریب اور اس کی قدروں کو اجاگر کریں۔

۱۰۔مسلمانوں کے درمیان تاریخ، عقائد، اور فقہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث و گفتگو کا دروازہ کھلا ہے، البتہ ان علوم میں بحث کرنے کا حق برادری اور غیر جانبداری اور حقیقت پسندی کی بنیاد پر ماہرین اور اہل نظر کو ہے لہٰذا بہتر ہے کہ اعتقادی، فقہی اور تاریخی مسائل پر گفتگو کے لیئے مخصوص مراکز کی تاسیس کی جائے۔

۱۱۔حوزہ علمیہ اور دیگر مراکز میں فقہ اتحاد اسلامی کی تعلیم اور فقہ، کلام، تفسیر موضوعی و تطبیقی میں با مقصد تبادلہ خیالات و مناظرہ کی تعلیم اور ایک دوسرے کے نظریات پر خوردہ گیری سے بچتے ہوئے باہمی احترا م کے اصولوں کے مطابق بحث ہونا چاہیے۔

۱۲۔کتاب و سنت کے پابند تربیتی مکاتب فکر کا احیاء کیا جائے تا کہ یہ مکاتب فکر انتہا پسند مادی رجحانات کم کرنے کا وسیلہ ہوں اور اسلامی اصولوں سے نا آگاہ نئے مسالک عوام کو دھوکے دینے سے باز رہیں۔

۱۳۔علمائے مذاہب تمام علمی وسائل یعنی ملاقاتوں، علمی و تخصصی سیمناروں اور تقریبی اداروں کے تحت، عمومی کانفرنسوں کے ذریعہ اعتدال و میانہ روی کو رواج دیں تا کہ اسلام کے گونا گون عملی طریقوں کے عنوان سے مذاہب میں لوگوں کے نقطہ نگاہ کی تصحیح ہوسکے۔علماء کو اس بات پر زور دینا چاہیے کہ اسلامی مذاہب کے مابین اختلاف تنوع و تکامل کے لیئے ہے، تضاد و دشمنی کے لیئے نہیں ہے۔اسی طرح علماء کو تمام اسلامی مذاہب کے امتیازات و خصوصیات کی شناخت اور ان کی تہذیب سے آشنائی کی ضرورت پر بھی زور دینا چاہیے۔

۱۴۔انتہا پسند، تشدد پسند اور قرآن و سنت سے ٹکراؤ رکھنے والے مکاتب فکر سے مقابلہ کی ضرورت

ہے،اور گروہوں اور رجحانات کے اسلامی ہونے کا معیارات مذکورہ بالا بندوں میں ذکر شدہ ضوابط کو قرار پانا چاہیے۔

۱۵۔ اسلام کے اعتقادی، فقہی و تربیتی مذاہب کو ان کے پیروؤں کے غلط اقدامات مثلاً بے گناہوں کا قتل، افراد کی بے حرمتی و بے عزتی، سرمایوں کو نابود کرنے ....کا ذمہ دار قرار نہ دینا چاہیے۔ ایسے اعمال کو روکنے کے اقدامات کئے جائیں جو مسلمانوں کے درمیان شگاف کو بڑھاوا دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو کفر و گمراہی سے نسبت دینے کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح تحریف کرنے والے اور فتنہ پیدا کرنے والے اعمال و مسائل کو حذف کیا جانا چاہیے جو مسلمانوں میں باہم غصہ اور پراکندگی کا باعث بنتے ہیں۔

۱۶۔ فتویٰ دینے کا حق صرف ان لوگوں کو ہونا چاہیے جو کتاب خدا و سنت پیمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس سے مربوط علوم مثلاً فقہ و اصول میں مہارت رکھتے ہوں اور منابع شریعت سے احکام دین کا استنباط کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوں، نیز زمانے کے تقاضوں، لوگوں کے حالات اور موضوعات سے آگاہ ہوں۔

اتحاد کے علمبردار

پیکر اخلاص حضرت آیت اللہ العظمیٰ بروجردی

رحیم ابوالحسنی
ترجمہ: نور محمد ثالثی

مقدمہ

عصر حاضر کے حساس زمانے میں اسلامی معاشروں کی اہم ضرورت، ہم آہنگی اور اتحاد و تقریب ہے، آج تمام باطل طاقتیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اسلام کے مقابلہ میں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، تمام مسلمانوں کو اس نکتہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے کہ سامراج اور استعمار کے اوپر غلبہ حاصل کرنے کا واحد راستہ تمام تر علاقائی، قومی اور مذہبی تفاوت کے باوجود دنیا بھر کے مسلمانوں کا متحد ہونا اور (مل کر سکولرازم اور دین سیاست سے جدا ہے) کی فکر سے ٹکر لینا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی دانشوروں (شیعہ ہوں یا سنی) نے سکولرازم نظریہ سے کافی حد تک مقابلہ کیا ہے اور مسلمانان عالم کے درمیان اتحاد و یگانگت کی خاطر انھوں نے بڑے خوبصورت اقدامات کئے ہیں، زیر نظر مقالہ عالم اسلام کے دو نمایاں عالم دین یعنی حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ

بروجردی اور شیخ شلتوت کی سوانح حیات ہے۔ان دونوں بزرگوں کا تعارف
کہ جنھوں نے اسلامی مذاہب کے درمیان اتحاد کی خاطر مشترکہ طور پر
بڑے موثر اور قابل ملاحظہ قدم اٹھائے ہیں ۔ امت اسلامیہ کے درمیان
اتحاد و یگانگت کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کو دو چند نمایاں کر دیتا ہے

حضرت آیۃ اللہ بروجردی کا حسب ونسب

آپ بروجرد شہر کے ''طباطبائی سادات'' سے تعلق رکھتے ہیں آپ کا سلسلہ نسب تیس درخشاں واسطوں سے حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے۔حضرت آیت اللہ بروجردی کے سلسلہ نسب (مادری و پدری دونوں) میں بڑی نمایاں دینی شخصیات نظر آتی ہیں جن کے کاندھوں پر گزشتہ کئی صدیوں میں دینی مرجعیت اور عالم شیعت کی ہدایت وقیادت کی ذمہ داری رہی ہے آپ کے پانچویں دادا حضرت آیت اللہ سید محمد طباطبائی بروجردی نجف کے بزرگ مراجع اور صاحب تالیفات تھے اور ملا محمد تقی مجلسی کی بہن کے بیٹے (بھانجے) تھے۔اسی طرح علامہ سید محمد مہدی طباطبائی معروف بہ بحر العلوم آپ کے دوسرے چچیرے دادا تھے جو کہ نجف اشرف کے بزرگ فقیہ اور علامہ وحید بہبہانی کے نمایاں شاگردوں میں سے تھے اور علامہ بحر العلوم کے بھائی حضرت آیت اللہ سید جواد طباطبائی آپ کے تیسرے دادا تھے اور ان کے فرزند میرزا علی نقی طباطبائی دوسرے دادا اور الحاج میرزا احمد طباطبائی پہلے دادا تھے کہ ان میں سے ہر ایک نمایاں مجتہد تھے ۔(دیکھئے کتاب : آیت اللہ بروجردی ، ۱۳۷۱ ش ، ابتدائی صفحات)

ولادت اور ابتدائے راہ

آیت اللہ سید حسین بروجردی ماہ صفر ۱۲۹۲ھ شہر بروجرد میں متولد ہوئے آپ کے پدر بزرگوار عالم دین تھے جن کا سید حسین کی پرورش میں قابل توجہ کردار رہا ہے۔آپ اپنے باپ کی ہدایات سے کتب خانے جاتے تھے اور آغاز تعلیم میں ہی کتاب گلستان سعدی، جامع المقدمات، سیوطی، منطق، کی تعلیم حاصل کر لی تھی پھر تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لئے اسی شہر کے مدرسہ ''نور بخش'' میں داخل ہوئے۔مقدماتی دروس کی تکمیل کے بعد فقہ واصول

کی تعلیم میں مصروف ہو گئے ۔آپ نے اس پوری تعلیمی زندگی میں تہذیب نفس اور اخلاقی فضائل و کمالات کو اپنا نصب العین قرار دیا یہاں تک کہ اس امر میں آپ حد کمال و پر پہنچ گئے ۔(گلشن ابرار،۱۳۸۲ش،ص ۶۶۲)

اصفہان کی طرف ہجرت

سید حسین نے ۱۳۱۰ھ ۱۸ سال کی عمر میں اصفہان کے حوزہ علمیہ کا رخ کیا اور اسی شہر کے مدرسہ صدر میں سکونت اختیار کی ۔اس زمانہ میں اصفہان کے حوزہ علمیہ میں بڑی رونق تھی اور سید حسین نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور چار سال کی مدت میں بزرگ اساتید جیسے میرزا ابوالمعالی کلباسی ،سید محمد تقی مدرسی ،سید محمد باقر درچہ ای ، جہانگیر خان قشقائی اور محمد کاشانی کے مہر مبارک سے فیض حاصل کرتے ہوئے اپنے علمی خزانوں کی تکمیل کی (مجلّہ حوزہ ،ش ۵۳،ص ۵۲ و ۵۷)ایک روز جب کہ آپ معمول کے مطابق درس وتحقیق میں سرگرم تھے باپ کی طرف سے خط پہنچا جس میں باپ نے بروجرد واپس بلایا تھا سید حسین مجبوراوطن کی طرف چل پڑے وہاں آپ کو پتہ چلا کہ بروجرد بلائے جانے کا مقصد یہ ہے کہ شادی کے مقدمات فراہم ہوں اور آپ کو رشتہ ازدواج سے منسلک کردیا جائے آپ نے ، پہلے تو اس خیال سے کہ ازدواجی زندگی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بنے گی شادی کرنے سے انکار کردیا لیکن پھر باپ کے اصرار پر سر تسلیم خم کردیا ،آپ اس دفعہ بروجرد میں مختصر قیام کے بعد اپنی زوجہ کے ہمراہ حوزہ علمیہ اصفہان واپس ہوئے اور پھر پانچ سال تک تعلیم وتحقیق میں مشغول رہے ،یعنی مجموعی طور پر حوزہ علمیہ اصفہان میں آپ نے ۹ سال کے اندر قابل قدر علمی مقام حاصل کرلیا۔(دوانی ،۱۳۷۲ش،ص ۹۵)

نجف اشرف کا سفر

الحاج آقا حسین ۱۳۱۹ھ میں پہلے اصفہان سے اپنے وطن بروجرد تشریف لے گئے پھر والد کے حکم سے نجف اشرف کا رخ کیا آپ نے نجف اشرف میں تین سال علمی حیات بسر کی اور اسی مدت میں آپ نے بزرگ اساتید کی خدمت میں جیسے آخوند خراسانی ،سید محمد کاظم یزدی ،اور شیخ الشریعۃ اصفہان سے فقہ واصول اور رجال کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔آپ کی ان بزرگوں کے درس میں محققانہ حاضری نے حوزہ میں بڑا جوش وجذبہ اور بیداری پیدا کردی اس طرح سے کہ آپ کی ذہانت ومطانت اور جلد سمجھنے کی صلاحیت نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔آپ کی

علمی شہرت اس دور کے اکثر علمی حلقوں میں تبادلہ خیال کا باعث بنی یہاں تک کہ آپ اپنے استاد بزرگوار آخوند خراسانی کی توجہ وعنایت کا مرکز بن گئے ۔ (مجلّہ حوزہ، شمارہ ۴۳و۴۴، ص ۳۱۴) آپ کی علمی شہرت نے نجف میں آپ کے لئے پڑھانے کا موقع فراہم کردیا اور آپ نے نجف کے بزرگوں سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تدریس کا کام شروع کردیا۔ اس وقت آپ نے نجف کے کچھ طلاب کے لئے کتاب ''فصول'' کی تدریس کا آغاز کیا نجف میں آیت اللہ بروجردی کی کتاب فصول کی تدریس کے اہم خصوصیات تھے خود آپ کے بقول میری ساری کوشش یہ ہوتی تھی کہ صاحب قوانین کے اوپر کئے گئے کتاب فصول کے سارے اشکالات کا جواب دوں ۔ (مجلّہ حوزہ، شمارہ ۴۳و۴۴، ص ۳۱۵)

وطن واپسی

آیت اللہ بروجردی نے دس سال نجف اشرف میں رہنے کے بعد دوبارہ نجف واپسی کے قصد سے ۱۳۲۸ھ میں والدین کا دیدار اور صلہ رحم کی غرض سے اپنے وطن واپس آئے اور علماء وعوام کے بے نظیر استقبال کے ساتھ بروجرد شہر میں داخل ہوئے۔ ابھی آپ کو شہر میں داخل ہوئے چھ مہینہ نہیں گزرا تھا کہ آپ کے عالم دین باپ کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا اور آپ سوگوار بن گئے۔ آپ نے اپنے استاد آخوند خراسانی سے گرچہ نجف واپسی کا وعدہ کیا تھا تاکہ نجف کی علمی مرکزیت کو تقویت پہنچانے میں اہم کردار ادا کریں، لیکن باپ کی رحلت نے حالات بدل دیئے اور آپ کو وطن میں رکنا پڑا۔ کچھ ہی دنوں بعد ۱۳۲۹ھ میں آپ نے اپنے روحانی باپ یعنی آخوند خراسانی کی رحلت کا داغ اٹھایا اور آپ کی طاقت جواب دے گئی آپ نے بارہا اپنے دوستوں کے سامنے اظہار کیا ہے کہ:

''میرے دونوں باپ کی رحلت نے مجھے تڑپا دیا اور بہت منقلب کیا'' (دوانی ۱۳۷۲ش، ص ۱۰۱)

بہر حال آیت اللہ بروجردی دوبارہ نجف واپس نہ ہوسکے اسی لئے آپ کو تقریباً تیس سال تک بروجرد میں رکنا پڑا۔ آپ اس پوری مدت میں تالیف تدریس اور حوزہ کی نمایاں شخصیات کو تعلیم دینے میں مشغول تھے آپ کے زیادہ تر مکتوب آثار اسی دور یعنی بروجرد میں سکونت سے متعلق ہیں۔ آپ کے وجود کی برکت سے بروجرد میں قم،

کاشان، اصفہان اور اہواز سے علم ومعرفت کے تشنہ افراد آنے لگے اور قریب تھا کہ یہ شہر علم ومعرفت کا مرکز بن جائے اس کے علاوہ آپ اسی شہر میں عوام کے دینی وسماجی مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔ظہرین کی نماز میں کچھ دنوں تک آپ نے مسجد شاہ میں بھی جماعت بڑھائی ہے اور اس کے ساتھ لوگوں کی دینی وسماجی مشکلات کو بھی حل کرتے رہے ہیں۔(دوانی ۱۳۷۲ء ش، ص/۱۰۲ و ۱۰۲)

دوسرے اسفار

آیت اللہ بروجردی ۱۳۴۴ھ میں عتبات عالیات کی زیارت کرتے ہوئے زیارت خانہ کعبہ سے مشرف ہوئے اور مناسک حج کی بجا آوری کے بعد ۱۳۴۵ھ میں مکہ معظّمہ سے کاظمین اور وہاں سے سامرا تشریف لے گئے وہاں دونوں اماموں کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور وہاں سے بصرہ کے راستہ ایران واپس ہوئے۔یہ زمانہ حاج آقا نور اللہ اور آقا نجفی اصفہانی کے دو بزرگ علماء کے قیام کا زمانہ تھا۔آیت اللہ بروجردی کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور تہران کے قید خانہ میں قید کردیا گیا اور وہاں پلیس کے کارندوں نے آپ سے باز پرس شروع کی۔تہران میں خود رضا شاہ آپ کی ملاقات کو آیا۔اس ملاقات سے اس کا مقصد آیت اللہ عبدالکریم حائری کو آپ کی نظر میں نیچا دکھانا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے کے مدمقابل لا کھڑا کرنا تھا۔رضا خان کی سید حسین کے ساتھ نرمی وملائمت اور مہربانی بھی اسی مقصد کے تحت تھی۔بہر حال آپ تقریبا سو دن تہران میں قید رہے۔قید سے رہائی کے بعد مشہد مقدس حضرت امام رضا علیہ السلام کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے اور تقریبا تیرہ مہینہ مشہد میں قیام کے بعد قم تشریف لائے اور مختصر قیام کے بعد اپنے وطن پلٹ گئے۔وہاں بروجرد کے لوگوں نے آپ کا زبردست استقبال کیا۔پھر آپ وہاں ۱۳۶۲ھ پھر پورنفوذ کے ساتھ قیام پذیر رہے،(دوانی ۱۳۷۲ء ش، ص/۱۰۴، مجلّہ حوزہ شمارہ ۴۳ و ۴۴، ص/۳۳۳ و ۳۳۷)

مرجعیت

آیت اللہ بروجردی کو ۱۳۶۴ھ میں بیماری کے باعث تہران لایا گیا اور فروز آبادی ہاسپٹل میں دو مرحلہ میں آپ کا اپریشن ہوا۔قم تہران اور دوسرے شہروں سے علماء کا سیلاب آپ کی عیادت کے لئے ٹوٹ پڑا۔اسی موقع

پر حوزہ علمیہ قم کے معروف و برجستہ فقہاء نے، جن میں سر فہرست حاج آقا روح اللہ خمینیؒ تھے فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے حضرت آیت اللہ بروجردی سے قم سکونت پذیر ہونے اور عالم تشیع کی مرجعیت نیز حوزہ علمیہ قم کی زعامت و سرپرستی قبول کرنے کی دعوت دی۔ (محمد واعظ زادہ خراسانی، ۱۴۲۱ق/ ۱۳۷۹ش، ص/ ۵۳)

موجودہ حضرات کے اصرار کو دیکھتے ہوئے آخر کار آیت اللہ بروجردی نے قبول فرمایا اور آپ ۲۶/ صفر ۱۳۶۴ھ میں مراجع، علماء اور قم کی عوام کے بے نظیر استقبال کے ساتھ شہر مقدس قم میں وارد ہوئے، قم میں مکمل طریقہ سے سکونت پذیر ہونے اور علماء و مراجع کے مکمل تعاون کے بعد آپ نے فقہ و اصول کی تدریس شروع کی۔ آپ کے درس میں بزرگ علماء و معروف فضلا و مدرسین منجملہ حاج آقا روح اللہ خمینیؒ سید محمد محقق داماد، حاج آقا مرتضی حائری وغیرہ بھرپور طریقہ سے شریک ہونے لگے (علی آبادی، ۱۳۷۹ش، ص/ ۴۴، مجلّہ حوزہ، ش/ ۴۲ و ۲۳) اسی طرح حضرت آیت اللہ صدر الدین صدر نے جو کہ خود بھی مراجع تقلید میں سے تھے اور حرم حضرت معصومہ کے بڑے صحن میں نماز جماعت بڑھاتے تھے اپنی جگہ آیت اللہ بروجردی کے حوالے کر دی اور ان کے احترام میں اپنی نماز جماعت ختم کر دی۔ مرحوم آیت اللہ محمد تقی خوانساری جو قم و نجف کے معروف مراجع میں شمار ہوتے تھے، احترام کی خاطر آپ کے درس میں شریک ہونے لگے۔ یہ سارے امور روز بروز حضرت آیت اللہ بروجردی کی مرجعیت اور رہبری و قیادت کی بنیادوں کو تقویت پہنچانے میں موثر ہوئے۔ (دوانی، ۱۳۷۲ش، ص/ ۱۱۹، ۱۲۰)

ان سب کے علاوہ ۱۳۶۵ھ میں حضرت آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی نجف اشرف کے بزرگترین مرجع تقلید کی رحلت ہوگئی اس لئے علماء نجف اور مرحوم آقا اصفہانی کے جملہ مقلدین اور پھر ان کے بعد دنیا بھر کے شیعوں نے آیت اللہ بروجردی کی طرف رخ کیا اور تھوڑی ہی مدت میں آپ کی مطلقہ مرجعیت ظاہر و آشکار ہوگئی حضرت آیت اللہ بروجردی کی تنہا مرجعیت اور آپ کی رہبری میں عالم تشیع کی مدیریت و قیادت تقریباً سولہ سال تک یعنی ۱۳۸۰ھ تک جاری رہی جس میں سیاسی و سماجی اعتبار سے بڑی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں حوزہ علمیہ قم کی مدیریتی ڈھانچہ میں بھی تبدیلی واقع ہوئی اور حوزہ علماء اور عوام کے مختلف طبقات میں قابل دید اتحاد و یکجہتی نظر آنے لگی۔ (اباذری، ۱۳۸۳ش، ص/ ۲۶ و ۲۷)

استنباط احکام میں جدت

الف)۔فقہ میں نئی روش

آیت اللہ بروجردی کی روش اجتہاد نے حوزہ علمیہ نجف اور قم دونوں میں احکام کے استنباط کرنے کی راہ میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کردی۔ اکثر بزرگ فقہاء کی روش احکام کے استنباط میں حدیثی کتابوں میں صرف متعلقہ احادیث کی طرف رجوع کرنا رہی ہے۔لیکن حضرت آیت اللہ بروجردی نے میدان فقاہت میں قدم رکھا اور دقیق طریقہ سے قدماومتاخرین کے اقوال وآراء کی طرف رجوع نیز ان کی تحقیق اور قدما کی کتابوں کو اصل منبع کے طور پر برتنا لازم سمجھا اور اس کے لئے انھوں نے ، اصول متعلقات ، کی تعبیر استعمال کی ۔ ہر فقہی فرع میں اگر کوئی حدیث دیکھتے تھے تو اس کے زمانہ ،صدور پر نیز اس کے متعلق سنی فقہا خاص طور سے مدینہ کے فقہا اور دیگر شہروں کے علماء کے آراء ونظریات نیز سوال کرنے والوں یا کسی بھی صورت سے متعلق افراد کے نظریات کو دیکھتے تھے اور اس فقہی فرع میں شیعہ علماء اور صحابہ،ائمہ نیز سوال کرنے والے نے اس سے کیا سمجھا ہے اور امام سے کیوں سوال کیا ہے ان تمام امور پر خاص توجہ رکھتے تھے ۔ واضح سی بات ہے آیت اللہ بروجردی کے علمی احاطہ اور چھوٹے بڑے تاریخی نکات پر تسلط نے استنباط احکام کی اس روش میں شایان شان مدد کی ہے۔(مجلّہ حوزہ ،ش ۴۳/ و ۴۴ ،سید جواد علوی کے مقالہ سے اقتباس)

ب)۔اصولی روش

آیت اللہ بروجردی کی علم اصول کے جملہ مسائل پر بے نظیر عنایت وتوجہ اس علم کی بے پناہ ترقی کا سبب بنی ہے۔آپ نے اجماع کے مسئلہ میں خاص مبنا اختیار کر رکھا تھا ''انسداد'' کی بحث میں آپ نے فقہا کے مشہور نظریہ کے برخلاف جو اس کو ظن کے لئے حجیت مطلق پر دلیل مانتے تھے آپ نے اپنے خاص بیان کی مدد سے اسے خبر واحد کی حجیت پر بھی دلیل سمجھتے تھے اسی طرح علم اصول کا موضوع ''حجت'' ہے یا ''ادلہ اربعہ'' یہ مسئلہ بھی آپ کے علمی ابتکار میں شمار ہوتا ہے۔(احمدی ودیگران ،۱۳۷۹ش ص/۱۲۸ ،بنقل از آیت اللہ لطف اللہ صافی گلپا ئگانی)

ج)۔علم رجال میں جدت

حوزات علمیہ میں اسلامی علوم کے شعبوں میں سے ایک ''علم رجال'' استنباط کے مہم ارکان میں شمار ہوتا

ہے۔آیت اللہ بروجردی کو اس علم میں خاصی مہارت حاصل تھی اور آپ احادیث کے راویوں کو اپنی انگلیوں پر شمار کرتے تھے۔(علی آبادی، ۱۳۷۹ش، ص/۸۳بنقل از آیت اللہ حسین نوری ہمدانی) آپ اس تبحر و توجہ کے ذریعہ اس علم میں بھی انوکھی جدت اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ گئے آپ نے بے نظیر اقدام کے تحت مورد نظر روایات کے سلسلہ سند کو متن سے جدا کیا اور بڑی باریک بینی و مہارت کے ساتھ چھان بین شروع کی کہ جس کی جزئیات کی وضاحت اس مقالہ کے مخاطبین اور خود مقالہ کی گنجائش سے باہر ہے لیکن راویان حدیث کی طبقہ بندی میں آپ کے کام کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس کے مفید نتائج سے سادگی کے ساتھ چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔آپ نے اس قیمتی کوشش میں صدر اسلام کے محدثین ۔ائمہ کے ادوار کے محدثین، غیبت صغریٰ اور کبریٰ کے محدثین کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا اور تمام راویوں کو ایک نئے دائرہ میں قرار دیا اور کر ہر دور کے طبقات کو معین و مشخص کر کے اور اس طبقہ بندی کو عصر حاضر سے متصل کر دیا اور آپ خود اس طبقہ بندی میں ۳۳ ویں طبقہ میں قرار پائے یہ انوکھی محنت و کوشش، رجالیوں اور تحقیقاتی حلقوں میں بے پناہ قیمتی آثار و فوائد چھوڑ گئی۔(علی آبادی، ۱۳۷۹ش، ص/۸۶، دوانی، ۱۳۷۲ش، ص/۱۶۰، اقتباس)

تقریب مذاہب کے افکار کی بنیادیں

احکام کے استنباط میں آیت اللہ بروجردی کے نئے اسلوب نے فقہ اہل سنت میں بھی وسیع پیمانے پر تحقیقات کا زمینہ فراہم کر دیا۔ائمہ معصومینؑ کے دور میں اہل سنت کے رائج فتاویٰ اور روایات کے مطالب سے آ گاہی حاصل کر کے احادیث ائمہ اور ان بزرگواروں کے کلام کو اور ان کے نقطہ نظر کو بہتر اور بآسانی سمجھا جاسکتا۔ ہے آیت اللہ بروجردی سے ایک جملہ بڑا مشہور نقل ہوا ہے کہ ''شیعہ فقہ اہل سنت کی فقہ کے حاشیہ میں ہے۔(واعظ زادہ خراسانی، ۱۴۲۱ھ/۱۳۷۹ش ص/۸۴) کیوں کہ طول تاریخ میں شیعوں کے پاس حکومت نہ تھی اور زیادہ تر حکومت بنی عباس کے ہاتھ میں تھی اور اہل سنت کے بیشتر فتاویٰ عوام الناس میں رائج تھے۔اماموں کے اصحاب اور محدثین شیعہ بھی ماحول پر حاکم فضا کو مد نظر رکھتے ہوئے ائمہ سے سوال کرتے تھے اور ائمہ بھی ماحول کو زیر نظر رکھ کر سوالوں کا جواب دیا کرتے تھے دوسرے لفظوں میں شیعہ فقہ اہل سنت کی فقہ پر ناظر تھی کیوں کہ ائمہ کے جوابات اور

کلام رائج فتاویٰ پر ناظر تھے اسی لئے آیت اللہ بروجردی اہل سنت کی کتابوں کا مطالعہ اوراس کی تحقیق کو فقہ واجتہاد کے صحیح طریقہ سے درک وفہم کے لئے ضروری مقدمہ سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر آپ کا اہتمام، مذاہب اربعہ کے فتاوی تو توجہ اور قابل دید معلومات کا سبب بنی اور آپ کو اہل سنت کے دیگر بزرگوں جیسے لیث ،ثوری ، اوزاعی ،ظاہری کے نظریات سے آگاہی اور اصحاب کے اراء ونظریات پر مکمل تسلط حاصل ہوگیا اور اکثر آپ کی یہ معلومات اتنی عمیق اور قوی ہوتی تھی کہ بعض اہل سنت کی بزرگ شخصیات جب آپ کی خدمت میں پہنچتیں اور نزدیک سے اس حقیقت سے آشنا ہوتیں تو انھیں بڑا تعجب ہوتا تھا۔(احمدی و دیگران، ۱۳۷۹ش ص ر ۱۲۷، بنقل از آیت اللہ صافی گلپائگانی)

آیت اللہ بروجردی کبھی بھی اہل سنت علماء کے نظریات کو منفی نظر سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ بھرپور کوشش کرتے تھے کہ ان کی دلیلوں کو حاصل کریں اور موضوع کی تہہ تک پہنچ جائیں بطور مثال یہ نمونہ ملاحظہ ہو: اہل سنت کی اکثریت نماز کے اول وقت میں ادا کرنے کے وجوب کے قائل ہیں اور اول وقت سے تاخیر کرنے کو بغیر کسی عذر کے جائز نہیں سمجھتے۔[۱] آقائے بروجردی فرمایا کرتے تھے:''اہل سنت کا فتویٰ اس جگہ سے وجود میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ امام جماعت تھے اور امام جماعت کو وقت معین پر حاضر ہونا چاہئے۔پیغمبر اکرمؐ نے اول وقت کو انتخاب کر رکھا تھا اور صحابہ وتابعین نے بھی پیغمبر اسلام کے عمل کو معیار قرار دیا تھا جو بعد میں مذاہب اہل سنت میں منعکس ہوا۔جب کہ جناب رسول خداؐ کبھی حالت اختیار میں اول وقت کی رعایت و پابندی نہیں کرتے تھے اور اہل بیت علیہم السلام نے بھی اس کی صراحت کی ہے اور یہی امر شیعہ علماء کے معروف فتوی کا معیار قرار پایا۔(واعظ زادہ خراسانی، ۱۴۲۱ھ ر ۱۳۷۹ش ص ر ۸۸)

آقائے بروجردی اس نظریہ کو غلط سمجھتے تھے اور اس کی تردید کرتے تھے کہ اہل سنت عمداً احکام کو بدل دیتے ہیں۔

۱۔البتہ بعض شیعہ علماء جیسے شیخ مفید اور آپ کے شاگرد شیخ طوسی بھی تاخیر کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

اسلامی اتحاد

آیت اللہ بروجردی کا خیال تھا کہ (مذاہب کے درمیان اتحاد) کے موضوع پر کام کرنا ہر شیعہ عالم کی حیاتی ذمہ داریوں میں سے ہے اور اس کے تحقق پذیر ہونے کے لئے ہر ایک کو کوشش کرنی چاہئے۔ یہاں تک کہ یہ بات مشہور ہے کہ آپ نے اپنی پر برکت عمر کے آخری ایام میں جب کہ آپ کے اوپر بار بار بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی غش سے افاقہ ہوتے ہی آپ پوچھتے تھے کہ " آقائے شیخ محمد تقی مصر تشریف لے گئے یا نہیں۔ (احمدی و دیگران، ۱۳۷۹ھ ش ص/۱۷۱ و ۲۳۳)

آقائے شیخ محمد تقی قمی، آقائے بروجردی کے جامع از ہر مصر اور مجمع تقریب مصر میں نمائندہ تھے اور ان دنوں مختصر مدت کے لئے ایران واپس ہوئے تھے اور قم میں موجود تھے۔

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری نے اپنے ایک مقالہ بنام "مزایا و خدمات آیت اللہ بروجردی" میں لکھا ہے:

جناب آقائے بروجردی کی خصوصیات میں سے ایک اسلامی اتحاد کے مسئلہ پر خاص عنایت و توجہ اور اسلامی مذاہب کے درمیان تقریب اور حسن تفاہم کا مسئلہ تھا۔ آپ کو چوں کہ اسلامی تاریخ اور اسلامی مذاہب سے بخوبی آشنائی تھی اور جانتے تھے کہ گزشتہ حکمرانوں کی اختلاف کی آگ بھڑکانے کی سیاست کس حد تک تاثیر رکھتی تھی اور آپ کو پتہ تھا کہ عصر حاضر میں بھی استعماری سیاستیں اس اختلاف اور تفرقہ سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہیں بلکہ اختلاف کی آگ بھڑکا رہی ہیں۔ آپ متوجہ تھے کہ دوسرے تمام فرقوں سے شیعوں کی دوری باعث بنی ہے کہ وہ شیعوں کو نہ پہچانیں اور ان کے بارے میں حقیقت سے دور تصورات پیدا کریں۔ انھیں سب وجہوں سے آپ بے حد چاہتے تھے کہ شیعوں اور سنیوں کے درمیان حسن تفاہم کا رابطہ برقرار ہو جائے، تاکہ ایک طرف اس مقدس دین کا عظیم مقصد یعنی اسلامی اتحاد قائم ہو سکے اور دوسری جانب شیعہ مذہب، شیعہ فقہ اور شیعی معارف سنی معاشرہ میں جو کہ مسلمانوں کی اکثریت کو تشکیل دیتی ہے متعارف ہو سکے۔ (مطہری، شش مقالہ، ۱۳۸۰ھ ش ص/۲۶۹، تکامل اجتماعی انسان، ۱۳۶۳ھ ش، ص/۲۰۶)

مطلق مرجعیت اور عمومی رہبری و قیادت کے منصب پر فائز ہونے سے چند سال قبل ہی جب کہ چند

شیعہ وسنی دانشمندوں کی کوشش سے ''دارالتقریب بین المذاہب الاسلامیہ'' تاسیس ہوئی آپ نے بھرپور طریقہ سے اس کی حمایت کی اور بروجرد سے قم تشریف لانے کے بعد اور مرجعیت کے عظیم منصب پر فائز ہونے کے بعد آپ نے حتی الامکان اس فکر وخیال کی حمایت جاری رکھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ عرصہ کے بعد پہلی مرتبہ شیعہ زعیم ومرجع اور سنی زعیم شیخ عبدالمجید سلیم اور ان کے انتقال کے بعد دو یا تین سال کے فاصلہ سے ان کے اور شیخ محمود شلتوت کے درمیان دوستانہ روابط قائم ہوئے اور خط وکتابت کا سلسلہ برقرار ہوا۔ شہید مطہری کے بقول مرحوم آیت اللہ بروجردی اتحاد اسلامی کے عاشق تھے اور آپ اس کے لئے بڑے فکرمند رہتے تھے۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ جب آپ پر پہلی بار دل کا دورہ پڑا اور کچھ دیر تک آپ بے ہوش رہے۔ جب ہوش آیا تو اس سے پہلے کہ اپنی حالت پر توجہ کریں اور کچھ اپنے سلسلہ میں گفتگو کریں تقریب اور اتحاد کا مسئلہ چھیڑ دیا اور فرماتے تھے: ''اس سلسلہ میں میری بڑی آرزوئیں تھیں'' (مطہری، شش مقالہ، ۱۳۸۰ش ص/۲۶۰، مطہری تکامل اجتماعی انسان، ۱۳۶۳ش، ص/۲۰۴)

اسلامی دارالتقریب کی حمایت

۱۳۲۷ش مطابق ۱۳۶۸ھ میں جناب آقائے مرحوم شیخ محمد تقی قمی اور جامع ازہر کے چند معروف علماء اور کچھ شیعہ علماء کے تعاون سے ''دارالتقریب بین المذاہب الاسلامیہ'' کی تاسیس عمل میں آئی آیت اللہ بروجردی اگرچہ اس مرکز کے بانیوں میں نہیں تھے لیکن آپ نے ابتداء ہی سے اس مرکز کی کارکردگیوں کی بھرپور حمایت کی۔ حتی کہ مالی امداد سے بھی آپ نے دریغ نہیں کیا۔ اس کے علاوہ شیخ الازہر عبدالمجید سلیم سے اور ان کے بعد شیخ محمود شلتوت سے خط وکتابت کرکے دنیائے شیعیت کا رابطہ بقیہ دنیائے اسلام سے مستحکم کیا اور بہت سی بدبینیوں اور بدگمانیوں کو دوستی اور محبت میں تبدیل کردیا۔ (واعظ زادہ خراسانی، ۱۴۲۱ھ، ۱۳۷۹ش ص/۳۶۹ و ۳۷۰)

اسی سوجھ بوجھ اور بہترین تدبیر کا نتیجہ تھا کہ شیخ محمود شلتوت نے وہ اپنا تاریخی فتویٰ صادر فرمایا۔[۱] اور تاریخ میں پہلی بار کسی سنی عالم دین نے رسمی طور پر شیعہ مذہب کو رسمی سمجھا اور شیعہ فقہ کے لئے مصر کی الازہر یونیورسٹی

۱۔ شیخ محمود شلتوت کا فتویٰ، شیعہ فقہ پر عمل کرنے کے جواز پر مشتمل تھا جب کہ اس سے پہلے سنی علماء، شیعہ مذہب کو ایک گمراہ فرقہ سمجھتے تھے اور کسی صورت سے شیعہ فقہ پر عمل کرنے کو جائز نہیں جانتے تھے۔

میں شعبہ تدریس کا دریچہ کھولا۔(مطہری۔شش مقالہ،۱۳۸۹ش،ص/۲۶۱،احمدی ودیگران،۱۳۷۹ش ص/۱۵۹، بنقل از آیت اللہ محمد فاضل لنکرانی)

آیت اللہ بروجردی کا کارساز اور مثبت کردار نیز ان روابط وتعلقات کی گہرائی کو سمجھنے کے لئے ہم دو تاریخی خط جن میں ایک شیخ عبدالمجید سلیم نے اور دوسرا شیخ محمود شلتوت نے تحریر فرمایا ہے نظروں سے گزار رہے ہیں:

من جانب شیخ عبدالمجید سلیم:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔آیت اللہ السید الجلیل حاج آقائے حسین بروجردی حفظہ اللہ کی خدمت میں سلام علیکم ورحمۃ اللہ:

امابعد: استاد محترم حضرت شیخ محمد تقی قمی، دار التقریب بین المذاہب الاسلامیہ کے سربراہ نے آپ کا زبانی پیغام پہنچایا۔آپ نے اظہار محبت فرمایا ہے اور خدمت اسلام و مسلمین کی راہ میں ہماری اور جماعت تقریب کی کوششوں کی قدردانی فرمائی ہے۔ مسلمین کے اتحاد و یکجہتی کی راہ میں کوششوں کے اثر انداز ہونے، آپس میں اتحاد و تفاہم وہم آہنگی ایجاد کرنے اور خودغرض لوگوں کے فتنہ وفساد کی اصلاح کے سلسلہ میں گفتگو فرمائی ہے۔خدا جانتا ہے کہ میری زندگی کی عزیز ترین اور شیرین آرزو یہی مسئلہ ہے اور میں جب تک زندہ ہوں اس کے لئے اور اس راہ میں کام کروں گا۔میں حضرت عالی کے اپنے تئیں اعتماد اور اپنی کوششوں کے سلسلہ میں جناب کے لطف وتوجہ کا شکرگزار ہوں۔جہاں تک مجھے آپ کے سلسلہ میں معلومات ہے آپ کے تعاون کو اس خدائی جہاد میں بہت بڑا سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ آپ ایران اور غیر ایران میں اپنے علم ودانش اور منزلت ومقام اور نفوذ کے باعث امت اسلامی کے امر کی اصلاح میں اللہ کے لئے کوشش کرتے ہیں۔تقریب بین مذاہب اسلامی کی فکر، آپ کی توجہ وعنایت سے بہرہ مند رہی ہے اور آپ کے تعاون اور متعدد مناسب موقعوں پر قیمتی مدد سے بہرہ مند ہوتی رہی ہے۔ہم تمام علمائے اسلام پر چاہے ہم شیعہ ہوں یا سنی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن وفکر سے اس قسم (تفرقہ پردازی) کے مطالب کو پاک وصاف کردیں اور اسلام کے روشن حقائق اور شریعت کے محکم اصول کی اس طرح نشر واشاعت کریں کہ لوگ خدائی ہدایت وحقیقت کے ذریعہ بیدار اور بابصیرت ہوجائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابھی حال ہی میں ہمیں عالم جلیل مرحوم سید محسن امین عامل کی رحلت کی خبر ملی ہے جب مجھے ان کے علم واخلاص دین وملت اسلامیہ کی راہ میں جہاد کے سلسلہ میں کچھ باتیں معلوم ہوئیں تو مجھے ان کی رحلت پر بڑا افسوس ہوا۔ اب میں اپنی خالص ترین تسلیت آپ کے حضور میں اور تمام شیعہ امامیہ بھائیوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور خدائے بزرگ کی بارگاہ سے چاہتا ہوں کہ محترم مرحوم ومغفور کو غریق رحمت کرے اور مجھے اور آپ کو اس مصیبت میں صابرین کا اجروثواب عطا فرمائے۔

والسلام علیکم جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ (اباذری، ۱۳۸۳ش، ص/۶۸)

من جانب شیخ محمود شلتوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سلام علیکم ورحمۃ اللہ امابعد: ہر چیز سے پہلے اپنے عزیز بھائی کی گرانقدر سلامتی چاہتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ برادر بزرگوار ہمیشہ مسلمانوں اوران کے درمیان اتحاد کے لئے برکات کا منبع ومخزن رہیں، برادر علامہ ومکرمی استاد قمی ایدہ اللہ فی جہادہ الشکور کی مسافرت سے جو موقع حاصل ہوا ہے اسے غنیمت سمجھ کر آپ کی بارگاہ میں خط لکھ رہا ہوں اور آپ کی کوششوں پر قدردانی کا اظہار کرتا ہوں۔ میں آپ کو بشارت وخوشخبری دیتا ہوں کہ تقریب کی راہ میں ہماری کاوشوں پر مجھ یقین ہے کہ آپ بھرپور طریقہ سے تائید فرمائیں گے۔ الازہر کے برگزیدہ گروہ نے اور تقریب میں فعال بھائیوں نے صدق دل سے جو جہاد کیا ہے وہ یقیناً ایمان ویقین پر مبنی تعاون ہے۔ دین کی خاطر، عالمی اور انسانی پیغام کی خاطر جوان پر واجب ہے اس کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں مجھے امید ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مشترکہ آرزو اور خاہشوں سے مطلع ہوتے رہیں گے والسلام علیکم۔ ذی قعدہ، ۱۳۷۶ھ۔ (اباذری، ۱۳۸۳ش، ص/۷۲)

جیسا کہ خط کی عبارت سے استفادہ ہوتا ہے سنی مذہبی رہنما بالخصوص الازہر یونیورسٹی کے رؤساء حضرت آیت اللہ بروجردی کے لئے بڑی عزت وعظمت اور اقتدار کے قائل تھے اور ہمیشہ عزت واحترام کی نظر سے آپ کو دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ بتایا جاتا ہے کہ جس وقت آقائے بروجردی کا خط الازہر یونیورسٹی کے سابق چیف شیخ مجید سلیم کو دستیاب ہوتا تھا تو آپ آقائے بروجردی کے خط کو لے کر بوسہ دیتے تھے اور شیخ محمود شلتوت بھی جنھوں نے

ان کے بعد الازہر یونیورسٹی کی ریاست سنبھالی آیت اللہ بروجردی کے خط کے ساتھ اسی طرح احترام آمیز سلوک کرتے تھے۔(احمدی، ودیگران، ۱۳۷۹ش، بنقل از لطف اللہ صافی گلپائگانی)

بہرحال مذہب کے درمیان ارتباط واتفاق کا درخت اوران کے درمیان تقریب کی اس طرح رشد وترقی سے آیت اللہ بروجردی بڑے خوشحال اورامیدوار تھے اور موقع بموقع مختلف مناسبتوں سے اپنے حلقہ درس میں اس موضوع کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ وہ کام میں ترقی سے خوشی کا اظہار فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ: ''تقریب کا مسئلہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہم بھی اسی میں سہیم وشریک رہے ہیں۔(احمدی ودیگران، ۱۳۷۹ ش،ص/۲۳۲)

تقریب کی تجاویز کا شیوہ

ہمیشہ صحیح تجویزات کا سر، صدمات پہنچانے والے عوامل کی صحیح طریقہ سے شناخت پر موقوف ہوتا ہے۔ آیت اللہ بروجردی شیعوں اور سنیوں کے درمیان اختلافات کو دو بنیادی نکتوں پر مرکوز سمجھتے تھے ایک تو خلافت اور جانشینی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسئلہ اور دوسرے کلام اہلبیت علیہم السلام کی حجیت کا مسئلہ۔

آیت اللہ بروجردی کے خیال میں پہلا مسئلہ ایک تاریخی مسئلہ ہے اور وہ جس نوعیت کا بھی تھا گزر چکا ہے اور کوئی ضروری ولازم نہیں ہے اسے دوبارہ چھیڑا جائے۔ مزید برآں تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسئلہ ہمیشہ شدید اختلاف اور دشمنوں کے لئے ناجائز فائدہ اٹھانے کا سبب بنا ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہ مباحث مفید بھی ہوں تو شیعوں اور سنیوں کے لئے فی نفسہ محترم ہیں اور طرفین میں سے کوئی دوسرے کو اپنے اعتقاد سے روک نہیں سکتا۔ بنابریں جو چیز آج بہت اہم ہے اور شیعہ وسنی کے درمیان مشترک نقطہ ومرکز بن سکتی ہے وہ کتاب خدا قرآن کے بعد اہلبیت علیہم السلام کی مرکزیت ومحوریت ہے جس کی دلیل حدیث ثقلین ہے جو کہ فریقین کے یہاں صحیح سلسلہ سند کے ساتھ نقل ہوئی ہے اور سب اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

آیت اللہ بروجردی اور شیخ محمود شلتوت کے اعزاز میں جو کانفرنس تہران میں منعقد ہوئی تھی اس میں آقائے ہاشمی رفسنجانی نے آیت اللہ بروجردی کے تقریبی افکار کو اس طرح پیش کیا تھا: آیت اللہ بروجردی درس میں

فرماتے تھے کہ ہمارا اہل سنت سے دو جہت سے اختلاف ہے، ایک خلافت کا مسئلہ اور دوسرے اقوال ائمہؑ۔ اور جو چیز ہمارے لئے اہم ہے وہ حجیت کا سئلہ ہے اور خلافت کا مسئلہ ایک تاریخی مسئلہ تھا جو آج تکرار کے قابل نہیں ہے ہمیں چاہئے کہ اہل سنت سے اقوال ائمہؑ کی حجیت کے مسئلہ میں بحث و گفتگو کریں جو ہمارے زمانے میں موثر ہے ۔صحیفہ حوزہ، ویژہ نامہ، جمہوری السلامی، دوشنبہ ۱۳۷۹/۱۱/۳، ص/۸)

آیت اللہ بروجردی کی نظر میں اتحاد کا مطلب و مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ میں ضم ہو جائے اور سب ایک گروہ اور ایک مذہب ہو جائیں بلکہ ان کی تاکید یہ تھی کہ مشترک امور کے بیان کے ساتھ تمام فرقوں کے درمیان یکجہتی، دوستی اور محبت پیدا ہو جائے اور سب کے سب دشمنان اسلام کے مدمقابل ایک ہو جائیں ۔آپ کی نظر میں اس مقدس مقصد کو پانے کا سب سے آسان، معقول اور کم خرچ راستہ حدیث ثقلین سے تمسک اور ائمہ معصومینؑ کو ان کی واقعی منزل کا مصداق جاننے کی راہ میں ہے آپ فرمایا کرتے تھے: اگر ہم شیعہ حضرات صرف اسی ایک راہ پر جس کی عام مسلمانوں کو آج ضرورت ہے، اکتفا کریں اور اپنے مطالب کو معقول طریقہ سے اہل سنت کے سامنے بیان کریں تو نتیجہ خیز ہوگا اور انھیں ہم کافی حد تک قانع کر سکتے ہیں' (واعظ زادہ خراسانی، ۱۴۲۱ھ/۱۳۷۹ ش، ص/۹۱)

آیت اللہ بروجردی منزل عمل میں بھی اسی تاریخ ساز مسئلہ کو حتمی طور پر مورد بحث قرار دیتے تھے جیسا کہ آپ نے حکم دیا کہ حدیث ثقلین کے تمام سلسلہ سند اور طرق روایت کو جمع کیا جائے اور اس بنیادی کام کو مرحوم آیت اللہ شیخ قوام الدین وشنوی نے انجام دیا اور دارالتقریب مصر کی جانب سے یہ کتاب منظر عام پر آئی ۔آیت اللہ بروجردی کی کوشش یہ تھی کہ شیعہ اور سنی علماء دونوں مذہب کے احوال و مبانی، روایات اور فقہی دلائل سے آشنا ہوں ،۔یہی وجہ ہے کہ آپ کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجہ میں دارالتقریب کی بہت سی سنی شخصیات شیعہ مبانی اور فقہی ادلہ سے آشنا ہو گئیں اور بہت سے مقامات پر انھوں نے شیعہ فقہ کے مطابق فتویٰ بھی صادر کیا اور اسی راہ میں علامہ حلی کی کتاب المختصر النافع مصر کی وزارت اوقاف کی مالی امداد اور کوشش سے وزیر اوقاف آقائے شیخ احمد حسن الباقوری کے مقدمہ کے ساتھ نشر ہوئی ۔(واعظ زادہ خراسانی، ۱۴۲۱ھ/۱۳۷۹ش، ص/۹۱) اسی طرح عربستان کے بادشاہ

سعود نے آیت اللہ بروجردی کو ایک جلد قرآن مجید اور خانہ کعبہ کا پردہ ہدیہ بھیجا اور آپ سے ملاقات کی آرزو ظاہر کی یہ سب انھیں کوششوں اور تقریبی افکار کا نتیجہ تھا۔

اگر چہ آیت اللہ بروجردی نے کچھ وجوہات کی بنا پر اس ملاقات کی درخواست کو قبول نہیں فرمایا لیکن تقریبی سرگرمیوں کی راہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے شکریہ کے خط میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک مفصل حدیث جس میں مناسک حج سے متعلق چار سو احکام کا تذکرہ آیا ہے اس کے پاس لکھ بھیجا۔(مجلّہ حوزہ، شمارہ ۴۳ و ۴۴ ص ۸۴؍ بنقل از آیت اللہ سید جعفر احمدی) اس حدیث کے مرقوم کرنے کا مقصد جو کہ اہل سنت کے سلسلہ سند سے نقل ہوئی ہے اور ان کی صحاح ستہ وغیرہ میں بھی نقل ہوئی ہے یہ تھا کہ شاہ عربستان اور اسلامی دنیا کی مذہبی و علمی شخصیات کو یہ سمجھا سکے کہ مراسم و مناسک حج کو مشترک مبانی اور متفق علیہ روایات کے مطابق یکساں اور ہم آہنگ انجام دیا جاسکتا ہے اور اس توحیدی تجلی گاہ سے اسلامی دنیا کی منفعت و مصلحت میں زیادہ سے زیادہ اور بہتر نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ خط رسالۃ الاسلام، مجلّہ میں جو کہ دار التقریب سے وابستہ تھا اور عربستان کے بہت سے رسائل و مجلّات اور اخباروں میں چھپ چکا ہے۔(واعظ زادہ خراسانی، ۱۴۲۱ھ/۱۳۷۹ش، ص ۲۳۷)

سیاسی اقدامات

حضرت آیت اللہ بروجردی کے سیاسی اقدامات اگر چہ اس مختصر تحریر میں نہیں بیان کئے جاسکتے، لیکن چند مختصر مواقع و مواقف کو شمار ضرور کیا جاسکتا ہے۔

الف)۔دربار شاہ اور مرجعیت

آیت اللہ بروجردی کی زعامت و مرجعیت کے زمانہ میں اگر چہ شاہی حکومت اور خارجی عناصر کے ساتھ سخت انقلابی ٹکر لینے کا زمینہ فراہم نہیں تھا کیوں کہ اسلامی انقلاب کے نتائج برداشت کرنے کی لوگوں میں ابھی نہ تو اتنی طاقت تھی اور نہ ہی اس قدر آشنائی و آگاہی تھی۔ یہ یقین کر لینا چاہئے کہ آپ کی مرجعیت کے زمانہ میں ہی آئندہ انقلاب کے لئے بہت سی توانائیاں انقلاب کے لئے تربیت پا چکی تھیں جنھوں نے قیام و انقلاب کے پورے دور میں تاریخ ساز کردار ادا کئے۔ بعض سیاسی صاحبان افکار و نظریات کے بقول رضا خان کی طرف سے شدید گھٹن کا

ماحول بنانے اور مسجدوں، امام بارگاہوں اور مدرسوں کو بند کرنے نیز لباس روحانیت پر روک لگانے کے بعد شیعوں کا ایک اہم کارنامہ کہ جس میں آیت اللہ بروجردی کا بہت بڑا حصہ رہا ہے حوزہ علمیہ قم اور ملک کے دوسرے شہروں میں دینی حوزات کی تشکیل وتوسیع ہے۔۔۔ ۱۳۳۰ سے ۱۳۴۰ اش کے دس سالہ فاصلہ میں جب کہ علماء کافی حدتک خاموشی کی زندگی بسر کررہے تھے حوزہ علمیہ قم نے تقریباً حضرت امام صادق علیہ السلام کے کام کے مانند کام انجام دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں دینی انقلابی مقلدین، روزانہ کے مسائل سے واقف اور علم وفہم کے ساتھ تربیت پا کر انقلاب کے لئے ذخیرہ بن گئے اور اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو محال تھا کہ ایران میں پہلوی شہنشاہیت کو شکست ہوتی۔(ہاشمی رفسنجانی، ۱۳۷۶اش، ج ۳ ص ۳۷۹)

ان سب کے باوجود آیت اللہ بروجردی کو جہاں کہیں بھی خطرہ کا احساس ہوتا تھا اقدام کرنے سے نہیں چوکتے تھے فوراً موقف اختیار کرتے تھے مثلاً شاہ ایران نے جب فارسی تحریر کو لاتین میں تبدیل کرنا چاہا تو آپ نے بھرپور طریقہ سے اس رسوا کن حرکت کا مقابلہ کیا اور فرمایا: جب تک میں زندہ ہوں اس کام کے عملی ہونے کی اجازت نہیں دوں گا۔اس کا نتیجہ چاہے جو ہو جائے۔(گلشن ابرار، ج ۲ ص ۶۷)

موجودہ معلومات کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ اس فرزانہ وآگاہ بزرگ مرجع نے مومن انقلابیوں کی مدد کے ساتھ ساتھ عجیب اور بڑی باریک سیاست اپنا رکھی تھی ان کا خیال تھا کہ لوگوں میں ابھی مشکلات اور دشواریوں کو برداشت کرنے کی زیادہ آمادگی پیدا نہیں ہوئی ہے، وہ حکومتی سختیوں سے روبرو ہوں گے تو مرجعیت کو اکیلا چھوڑ سکتے ہیں، اس لئے آپ دربار شاہ سے براہ راست ٹکرانے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے اور دوسری جانب شاہ کو اکیلا چھوڑنے اور اسے مکمل طریقہ سے اپنے سے علحدہ کرنے کی صورت میں اس کے بیگانوں کے دامن میں مزید چلے جانے کا اندیشہ تھا۔اس لئے کبھی بھی آپ اس سے مدارا کرتے تھے تا کہ وہ مغرور حاکم اپنے پائے کمزور نہ سمجھ بیٹھے اور اپنے تحفظ کے لئے بیگانوں کی پناہ میں نہ چلا جائے۔(گلشن ابرار ۱۳۸۲اش، ج ۲ ص ۶۷)

ب: سیاسی فرقہ بہائیت کا مقابلہ

آیت اللہ بروجردی کے وطن میں سکونت ہونے کے زمانہ میں اس گمراہ فرقے نے بروجرد اور اس کے

مضافات میں اپنی سرگرمیوں کو حکومتی اداروں میں خاص نفوذ و رسوخ کے باعث بہت وسیع کر لیا تھا۔ چوں کہ آیت اللہ بروجردی اس مسئلہ سے آگاہ تھے لہٰذا آپ اعتراض کے طور پر اس شہر سے باہر نکل آئے اس سے لوگوں میں ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ ٹیلی گراف خانوں پر ٹوٹ پڑے اس موقع پر مرکزی حکومت کو خطرہ محسوس ہوا اس لئے بہت جلد آپ کو شہر میں واپس کرنے کے مقدمات فراہم کرنے میں جٹ گئے اور حکم صادر ہو گیا کہ بہائیوں کے علنی و عمومی جلسوں اور اجتماعات پر پابندی لگائی جاتی ہے اور اس گروہ سے وابستہ افراد حکومتی اداروں سے معزول کئے جاتے ہیں اور پھر آیت اللہ بروجردی لوگوں کے تاریخی اور انقلابی استقبال کے ساتھ وطن واپس ہو گئے۔ (احمدی و دیگران ۱۳۷۹ش، ص ۳۴۲)

اسی طرح آپ نے اپنی عمومی مرجعیت کے زمانہ میں قم سے ہی پورے ملک میں بہائیت کے خلاف محاذ کو وسعت بخشی جس کے نتیجہ میں ۱۳۳۵ش میں بہائیوں کی فعالیت و سرگرمی کا تہران میں واقع حظیرۃ القدس نامی مرکز ڈھا دیا گیا۔ اسی طرح آپ نے ماہر خطیب آپ مرزا محمد تقی فلسفی کو حکم دیا کہ تہران کی شاہی مسجد میں منبر پر تشریف لے جائیں اور بہائیت کے باطل افکار لوگوں کے کانوں تک پہنچائیں آقائے فلسفی کی دلائل پر مبنی اور محکم تقریریں ریڈیو سے بھی نشر ہوتی تھیں۔ (احمدی و دیگران، ۱۳۷۹ش ص ۵۵، ۱۴۱ و ۱۹۰)

ج: آقا حسین قمی کے اقدامات کی حمایت

۱۳۲۰ش میں شاہ ایران کے فرار کر جانے کے بعد آیت اللہ حاج آقا حسین قمی جنھیں مسجد گوہر شاد کے تاریخی قیام کے نتیجہ میں کربلا جلاوطن کر دیا گیا، وطن واپس ہوئے اور انھوں نے کشف حجاب کے سامراجی قانون کے مقابلہ میں بڑا سخت موقف اختیار کیا اور پرائمری اور ہائی اسکولوں میں مذہبی مراسم قائم کرنے کی آزادی کا مانگ کی شاہ اور حکام آپ کی مانگوں کو پورا کرنے میں سستی برت رہے تھے یہاں تک کہ آیت اللہ بروجردی نے جو کہ اس زمانہ میں بروجرد میں قیام پذیر تھے حاج آقا حسین قمی کی حمایت میں اس زمانے کے وزیر اعظم کے پاس ٹیلی گراف بھیجا جس کی عبارت یہ تھی:

آیت اللہ کے مطالبات ہمارے بھی مطالبات ہیں اگر ان کی مانگوں کو پورا نہ کیا گیا میں خود تہران کے

لئے نکل پڑوں گا اور اس کے برے نتائج کے ذمہ دار خود حکام ہوں گے۔ (مجلّہ حوزہ، ش ۴۳، ۴۴، ص ۲۳۲، بنقل از سید جواد علوی)

اس ٹیلی گرام کی خبر پھیلنے سے لوگوں کے درمیان خاص طور سے لرستان کے عشائر لوگوں کے سربراہوں نے آیت اللہ بروجردی کی حمایت میں تحریکیں کیں اس طرح کہ حکومت کو خطرہ محسوس ہوا اور وہ مجبور ہو کر آپ کی مانگوں کے سامنے جھک گئی۔ آیت اللہ بروجردی اسی طرح ''تیل قومیائے جانے کی تحریک'' شاہ کی اصلاح اراضی کی سازش کو روکنے، اور ایران میں آتش پرستی کے مظاہر کو روکنے کے لئے مکمل طور سے دخیل تھے۔

آثار و تالیفات

آپ نے شاگردوں کی تربیت و تدریس کے پہلو بہ پہلو وسیع پیمانے پر تحقیقاتی امور انجام دیئے ہیں اور آپ کے مجموعی آثار کو رجالی، حدیثی، فقہی اور اصولی چار دستوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اختصار کے طور پر ہم بعض مطبوعہ آثار کی فہرست الفبا کے حساب سے قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔

۱۔ **الاحادیث المقلوبہ و جوباتھا**: چند مقلوب حدیث کے بارے میں آیت اللہ العظمیٰ سید حسین آقا بروجردی طباطبائی سے سوال کیا گیا تھا جن کے جوابات کے ساتھ نیز محمد رضا حسینی جلالی کے مقدمہ اور ترجمہ کے ساتھ یہ کتاب دارالحدیث قم سے ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۳۸۴ش ۶۷ صفحات پر مشتمل چھپ چکی ہے۔

۲۔ **البذر الزاھر فی صلاۃ الجمعۃ و المسافر**: آیت بروجردی کے درس کا مجموعہ ہے جسے آیت اللہ منتظری نے قلم بند فرمایا تھا، قم کتب خانہ آیت اللہ منتظری ۱۴۱۶ھ/۱۳۷۵ش صفحات ۳۹۹۔

۳۔ **البیان الوافی فی التعریف بکتاب ترتیب اسانید الکافی للامام البروجردی**: محمود دریاب النجفی قم، موسسۂ آیت اللہ بروجردی ۱۴۲۲ھ/۱۳۸۵ش۔

۴۔ **ترتیب اسانید کتاب التھذیب للشیخ الطوسی : تالیف حسین الطباطبائی البروجردی، فھرست کتاب التھذیب مرتبا علی الحروف و فھر س کتاب الاستبصار مرتبا علی الحروف، رتبھا حسن النوری الھمدانی، مشھد استانہ الرضویہ المقدسہ، مجمع**

البحوث الاسلامیہ ۱۴۱۴ھ/۱۳۷۲ش ۵۴۴ صفحہ۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ترتیب الاسنید یا تجرید الاسانید یا طبقات الرجال جیسی کتابیں علم رجال میں آیت بروجردی کے ایجادات میں سے شمار ہوتی ہیں ان مجموعوں میں حدیثی کتابوں جیسے کافی، استصار، تہذیب، امالی، خصال اور رجالی کتابوں جیسے رجال نجاشی ورجال طوسی کو اصلی متون سے جدا کر کے ان پر تحقیق کی گئی ہے۔

۵۔ تقریر بحث سید نا الستاد المرجع الدینی الاکبر الایۃ اللہ العظمی الحاج السید حسین الطباطبائی البروجردی فی القبلہ و الستر و الساتر و مکان المصلی، تقریر علی پناہ الاشتہاردی، قم جامعہ مدرسین، ۱۴۱۶ھ/۱۳۷۴ش ۲ جلد۔

۶۔ تقریرات ثلاثہ: الوصیۃ و منجزات المریض . میراث الازواج الغصب، حسین البروجردی الطباطبائی۔ تقریر علی پناہ الاشتہاردی، قم جامعہ مدرسین، ۱۴۱۳ھ/۱۳۷۲ش، ص/۲۳۱۔

۷۔ تقریرات فی اصول الفقہ، آیت اللہ العظمی حسین البروجردی، قدر ہا علی پناہ الاستہاردی، قم جامعہ مدرسین، ۱۴۱۷ھ/۱۳۷۵ش، ۳۰۶ صفحہ۔

۸۔ جامع احادیث الشیعہ: حسین الطباطبائی البروجردی، قم، مدینۃ العلم، ۱۳۸۱ش، ۳۰ جلد، حدیث کا یہ گراں قدر مجموعہ کتاب وسائل الشیعہ کی تکمیل، اس کے نواقص کی برطرفی جیسے تقطیع روایات تکرار اسناد، تکثیر البواب، ضخامت کی زیادتی وغیرہ جیسے امور کے لئے آیت اللہ بروجردی کیجدت اور تالیف میں سے ہے اور بہت سی سہولیات جیسے احادیث پر جلد سے جلد دسترسی اور ان سے استنباط میں سرعت وغیرہ میں مددگار ثابت ہوتی ہے اب تک اس مجموعہ کی تیس جلدیں چھپ چکی ہیں۔

۹۔ حاشیۃ العروۃ الوثقیٰ، تالیف محمد کاظم یزدی، با حواشی آیت اللہ بروجردی تہران، اسلامیہ ۱۳۷۳ھ/۱۳۲۲ش ۷۴۶ ص۔

۱۰۔ الحاشیہ علی کفایۃ الاصول، طرح مبانی حسین الطباطبائی البروجردی، تالیف بہاء الدین

المجتبی البروجردی قم، انصاریان، ۱۴۱۲ھ/۱۳۷۹ش متعدد جلدیں۔

۱۱۔ حاشیة علی وسائل الشیعه

۱۲۔ الحجة فی الفقة تقریرات و تحصیلات من فراسات حسین طباطبائی البروجردی، تالیف مہدی حائری یزدی، موسسۃ الرسالۃ حسینہ عمادزادہ، ۱۴۱۹ھ/۱۳۷۷ش ۷ جلدیں۔

۱۳۔ خاندان آیت اللہ بروجردی، نوشتہ آیت اللہ بروجردی، مقدمہ وترجمہ اور پاورقی ازعلی دوانی، قم انصاریان، ۱۳۷۱ش ۱۵۲ص۔

۱۴۔ رسالۃ توضیح المسائل کہ جس کا متن آیت اللہ بروجردی کے فتاوای کے مطابق ہے آیات عظام اور شیعہ علماء کے حواشی کے ساتھ، مؤلف، غلام حسین رحیمی اصفہانی، تہران، جاویدان، فراہانی، ۱۳۴۸ش ۵۹۲ص۔

۱۵۔ رسالہ شریفہ مناسک حج۔ مطابق با فتاویٰ آیت اللہ بروجردی بہ کوشش محمود کتاب چی، تہران، اسلامیہ ۱۳۶۷ھ، ۱۳۲۶ش ۱۴۰ص۔

۱۶۔ لمحات الاصول، افادات الفقیۃ الحجۃ آیت اللہ العظمیٰ بروجردی، بقلم الامام الخمینی، تحقیق موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینیؒ، تہران موسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ، ۱۴۲۱ھ/۱۳۷۹ش، ۵۲۱ص۔

۱۷۔ المجدی بحوث فی الوصیۃ ومنجزات المریض واقرار المریض، لمقررہ علی الصافی الگلپائگانی، قم گنج عرفان ۱۴۲۱ھ/۱۳۸۱ش ۲۱۵ص۔

۱۸۔ المنہج الرجالی والعمل الرائد فی الموسوعۃ الرجالیۃ: الاحادیث المقلوبہ وجواباتہا، حسین الطباطبائی البروجردی، بہ اہتمام محمد رضا الحسینی الجلالی، قم، مکتب الاعلام السلامی، ۱۴۲۰ھ/۱۳۷۸ش ۳۸۴ص۔

۱۹۔ نہایۃ الاصول۔ تقریر ابحاث حسین الطباطبائی البروجردی، بہ قلم حسین علی المنتظری، تہران نشر تفکر، ۱۴۱۵ھ/۱۳۷۳ش، متعدد جلدیں۔

۲۰۔ نہایۃ التقریر فی مباحث الصلاۃ تقریراً لما افادہ حسین الطباطبائی البروجردی تالیف فاضل اللنکرانی،

قم مرکز فقہ الائمۃ الاطہار ۱۴۲۰ھ/۱۳۷۸ش، کئی جلدیں۔

آفتاب زندگی غروب ہوگیا

دھیرے دھیرے ۱۳۸۰ھ شوال کا مہینہ آپہنچا اور بیماری نے اس ۸۸ سالہ عالم اسلام کے عظیم مرجع کے جسم اقدس پر اپنا پنجہ گڑا دیا ای دشوار بیماری دوسری تکالیف سے متفاوت تھی جو اس عظیم شخصیت کو اذیت دے رہی تھی، انھیں دنوں کچھ عقیدت مندوں نے آپ کی عیادت فرمائی استاد جو کہ بہت زیادہ غمگین تھے سر اٹھایا اور فرمایا: سرانجام ہماری عمر گزر گئی ہم چلے اور اپنے لئے کچھ زاد راہ نہیں بھیج سکے نہ ہی کوئی قیمتی عمل انجام دے سکے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا: آقا آپ اس طرح فرما رہے ہیں آپ نے اتنے سارے آثار چھوڑے ہیں پرہیزگار شاگردوں کی تربیت فرمائی ہے قیمتی کتابیں تالیف کی ہیں۔ مسجدیں، کتب خانے بنوائے ہیں ایسی باتیں تو ہم لوگوں کو کہنی چاہیں۔ پارسا شیعہ فقیہ نے فرمایا: عمل میں اخلاص پیدا کرو کہ وہ (خدا) بڑا بینا اور نقاد ہے۔ (گلشن ابرار، ۱۳۸۲ش، ج۲/ص۶۷۲)

اس گفتگو نے حاضرین کو بہت متاثر کیا چند روز کے بعد ہی استاد بزرگوار کا جنازہ مزید درد وغم کا باعث بنا۔ آخر کار اسی بہادر فقیہ کا جنازہ دسیوں ہزار سوگواروں کے نوحہ وماتم کے درمیان بڑی عظمت کے ساتھ تشیع ہو رہا تھا جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے اور حضرت معصومہ فاطمہؑ کے حرم مطہر سرہانے کی سمت میں مسجد اعظم کے ورودی دروازے کے پہلو میں دفن کیا گیا یہ مسجد آپ ہی کی یادگار ہے اور اس کے ساتھ ہی ایران کے تمام شہروں میں عزاداری کا آغاز ہوگیا دکانیں بند ہوگئیں۔ سڑکوں، گلیوں اور بازاروں کے اوپر سیاہ پرچم لہرانے لگے۔ اور اکثر اسلامی ملکوں خاص طور سے نجف اور کربلا میں بڑی عظیم الشان مجلس ترحیم اور مراسم عزاداری برپا ہوئیں اور ایران میں ان مراسم کا سلسلہ آپ کے چہلم تک جاری رہا۔ اسلامی ملکوں کے نمائندوں اور سفیروں نے اظہار ہمدردی کیا یہاں تک کہ روس امریکہ اور انگلینڈ کے سفارتخانوں کے پرچم اظہار عزا کے طور جھکا دئے گئے۔ مرحوم آیت اللہ مجتبی عراقی آیت اللہ بروجردی کی تدفین وتشیع کے ذمہ دار تھے فرماتے ہیں:

''خداوند متعال نے مجھے یہ افتخار عطا فرمایا کہ اس بزرگ ہستی کو سپرد لحد کروں یہ عمل آپ کی وصیت کے

مطابق انجام پایا اس واقعہ سے مجھ پر عجیب وغریب حالت طاری تھی اور جس وقت میں قبر میں اترا دفن کے تمام مستحبات میرے ذہن میں آگئے جو پہلے سے ذہن میں نہیں تھے'' (احمدی ودیگران ۱۳۷۹ش ص ۱۷۹)

عصر حاضر کی شیعہ تاریخ کے اس عظیم المرتبت انسان کی مفصل سوانح حیات کا اس مختصر تحریر سے کبھی ادا نہیں ہوسکتا۔ جو کچھ اس مختصر مقالہ میں آیا ہے وہ صرف اس عظیم دینی مرجع اور فقیہ الٰہی کی یاد تازہ کرنے کا ایک بہانہ تھا کہ انشاءاللہ ہمارے لئے اور تمام پاکیزگی اور سچائی کو دوست رکھنے والوں کے لئے درس ہوگا۔ والسلام

منابع و مآخذ

۱۔ آیت اللہ بروجردی، خاندان آیت اللہ بروجردی، مقدمہ وترجمہ از علی دوانی، قم انصاریان ۱۳۷۱ش۔

۲۔ اباذری، عبدالرحیم، آیت اللہ بروجردی آیت اخلاص، تہران، مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی، ۱۳۸۳ش۔

۳۔ احمدی مجتبیٰ و دیگران، چشم و چراغ مرجعیت، مصاحبہ ویژہ مجلّہ حوزہ با شاگردان آیت اللہ بروجردی، قم، دفتر تبلیغات اسلامی مرکز انتشارات ۱۳۷۹ش۔

۴۔ دوانی علی زندگانی زعیم بزرگ عالم تشیع آیت اللہ بروجردی، ویرایش ۲، تہران، نشر مطہر، ۱۳۷۲ش۔

۵۔ شکوہ فقاہت: یادنامہ مرحوم آیت اللہ حاج آقا حسین بروجردی تہیہ ونشر مرکز انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی حوزہ علمیہ قم، ۱۳۷۹ش۔

۶۔ صحیفہ حوزہ، ویژہ نامہ روزنامہ جمہوری اسلامی، دوشنبہ ۳/۱۱/۷۹

۷۔ عبیری، عباس، آیت اللہ بروجردی زعیم بزرگ، تہران، سازمان تبلیغات اسلامی، ۱۳۸۰ش۔

۸۔ علی آبادی، محمد، الگوی زعامت: سرگذشتھای ویژہ حضرت آیت اللہ بروجردی از زبان علما ومراجع ہمراہ باتقریظ آیت اللہ عبد الصاحب مرتضوی لنگرودی، قم، انتشارات لاہیجی ۱۳۷۹ش (چاپ قبلی از انتشارات عصمت، ۱۳۷۸)

۹۔ گلشن ابرار، خلاصہ ای از زندگی اسوہ ھای علم و عمل، تہیہ و تدوین جمعی از پژوہشگران حوزہ علمیہ قم، زیر نظر پژوہشکدہ باقر العلوم، قم نشر معروف، ۱۳۸۲ش (دورہ سہ جلدی)
۱۰۔ مجلّہ حوزہ، شمارہ ھای مختلف کہ در متن آمدہ است۔
۱۱۔ مطہری، مرتضی، تکامل اجتماعی انسان بہ ضمیمہ ھدف زندگی: الھامی از شیخ الطائفہ، مزایا و خدمات مرحوم آیت اللہ بروجردی، تہران و قم صدرا، ۱۳۶۳ش۔
۱۲۔ مطہری، مرتضی، شش مقالہ، ختم نبوت، پیامبر امی، ولائھا و ولایتھا، ویرایش ۲، قم صدرا، ۱۳۸۰ش۔
۱۳۔ واعظ زادہ خراسانی، محمد، زندگی آیت اللہ بروجردی و مکتب فقہی، اصولی، حدیثی و رجالی وی، تہران، مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی، ۱۴۲۱ھ/۱۳۷۹ش
۱۴۔ ہاشمی رفسنجانی، اکبر، خطبہ ھای جمعہ، زیر نظر محسن ہاشمی رفسنجانی، تہران، دفتر نشر معارف انقلاب، سازمان مدارک فرہنگی انقلاب اسلامی ۱۳۷۶ش۔

پیکر شجاعت

شیخ محمود شلتوت

(۱۳۱۰ھ۔۱۳۸۳ق)

رحیم ابوالحسنی

ترجمہ: نور محمد ثالثی

شیخ محمود شلتوت پانچ شوال ۱۳۱۰ھ کو مصر کے بحیرہ اسٹیٹ میں واقع شہر ''ایتای البارود'' کے ایک دیہات ''منشاۃ بنی منصور'' میں وہاں کے ایک علم و ادب پرور گھرانے میں پیدا ہوئے آپ کے باپ شیخ محمد نے آپ کا نام محمود رکھا اور بیٹے کی تعلیم و تربیت کی راہ میں انتھک کوشش کی۔

تعلیم کا آغاز

ابھی محمود کی عمر کی ساتویں بہار نہیں گزری تھی کہ باپ کا انتقال ہوگیا آپ کے چچا عبدالقوی شلتوت نے آپ کی سرپرستی کا بیڑا اٹھایا۔ ابتدا سے ہی محمود کے تمام کاموں میں مہارت و استعداد کے آثار نمایاں تھے اسی لئے آپ کے چچا نے علوم و معارف اسلامی کے حصول کی خاطر گاؤں کے مکتب خانہ بھیج دیا۔

مصر کے مکتب خانوں میں یہ قانون تھا کہ دروس ادبیات کی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے طالب علم پورے قرآن مجید کو حفظ کرے۔ محمود بھی دوسرے طالب علموں کی طرح ہر چیز سے پہلے قرآن حفظ کرنے میں مشغول ہوئے اور بڑے مختصر عرصے میں قرآن حفظ کرلیا۔

تکمیلی تعلیم

شیخ محمود شلتوت نے ۱۳۲۸ھ میں (بمطابق ۱۹۰۶ء) علمی کمالات کے حصول کی خاطر شہر اسکندریہ کا سفر کیا اور اسکندریہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔

آپ کی علمی صلاحیت اور قابلیت سے وہاں کے اساتذہ اور طالب علموں کو حیرت ہوئی آپ نے اپنی انتھک کوششوں کو بروئے کار لاکر ۱۳۴۰ھ (مطابق ۱۹۱۸ء) میں اسکندریہ یونیورسٹی سے وہاں کا سب سے بڑا علمی مدرک حاصل کرلیا اور کالج کے ممتاز شاگرد کی حیثیت سے آپ کا تعارف ہوا۔ جب کہ ابھی آپ کی عمر صرف ۲۵ سال تھی۔ آپ ۱۳۴۱ھ میں (فروری ۱۹۱۹ء) میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسی کالج میں بحیثیت استاد کے تدریس میں مشغول ہوئے۔

شیخ شلتوت کی تعلیم وتدریس کا زمانہ مصر کے عوامی انقلاب کا دور تھا جس کی قیادت سعد زغلول کر رہے تھے۔ مصر کے شہر اور دیہات سعد زغلول کی حمایت اور غاصبوں کے خلاف مظاہرات سے چھلک رہے تھے۔ شیخ شلتوت میں غیر جانب دار نہیں رہے اور اپنے انقلابی فریضہ پر عمل کرتے ہوئے مصری عوام کے انقلاب میں زبان و قلم سے خدمت میں مشغول ہوگئے۔

الازہر میں ورود

شیخ شلتوت جو شیخ محمد مصطفیٰ مراغی شیخ شلتوت سے تعجب خیز عقیدت رکھتے تھے اور بڑے متاثر تھے جس وقت شیخ مراغی ۱۳۶۰ھ (۱۹۳۸ء) میں الازہر یونیورسٹی کے رئیس تھے انھیں شیخ محمود شلتوت کا ایک مقالہ مطالعہ کرنے سے شلتوت کی گہری فکر، ادبیات عرب پر تسلط اور نگارش میں مہارت کا اندازہ ہوا لہٰذا انھوں نے شیخ شلتوت سے الازہر یونیورسٹی کی عالیہ کلاسوں میں تدریس کی دعوت دی۔ شلتوت جو کہ اسکندریہ یونیورسٹی میں شاگردوں کی تعلیم وتربیت میں مشغول تھے، اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے قاہرہ روانہ ہوگئے اور الازہر یونیورسٹی میں بحیثیت استاد کے مشغول تدریس ہوئے۔

آپ کی پے در پے کامیابیاں باعث ہوئیں کہ ۱۳۶۱ھ (مطابق ۱۹۲۹ء میں آپ کا انتخاب الازہر یونیورسٹی کے خصوصی مرحلہ کے لئے مدرس کی حیثیت سے ہوا۔

اساتید

شیخ شلتوت نے بہت سے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے لیکن تین اساتذہ کا آپ کی تعلیم و تربیت میں بڑا اہم کردار رہا ہے۔

۱۔استاد شیخ الجیزاوی: آپ شیخ شلتوت کے اسکندریہ کالج میں استاد تھے۔

۲۔شیخ عبدالمجید سلیم: شیخ سلیم نے ۱۳۰۴ھ (اکتوبر ۱۸۸۲ء) میں مصر میں آنکھ کھولی۔ مقدماتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد الازہر یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ۱۳۳۰ھ میں اسی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے۔ تعلیم پوری کرنے کے بعد آپ قاضی، مدرس، ہیئت فتویٰ کے منبر کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور آپ شیخ محمد عبدہ کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں اپنی تحصیلات کو مکمل کرنے کے بعد اسی کالج میں استاد کی جگہ تدریس کرنے میں مشغول ہوگئے شیخ شلتوت کی تعلیم وتدریس کا زمانہ (۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۱۹ء) سعد زغلول کی رہبری وقیادت میں مصر کے عوامی انقلاب کے ہم عصر تھا۔ مصر کے شہرو دیہات سعد زغلول کی حمایت اور غاصبوں کے خلاف مظاہرات سے سرشار تھے شیخ شلتوت بھی بے طرف وغیر جانبدار نہیں تھے اور اپنی انقلابی ذمہ داریوں کو پرعمل پیرا تھے اور اپنی زبان وقلم سے مصری عوام کے انقلاب کی خدمت میں مصروف تھے۔

الازہر یونیورسٹی میں داخلہ

شیخ محمد مصطفیٰ مراغی کا، علامہ شلتوت پر کافی حد تک عقیدتی، مذہبی اثر تھا شیخ مراغی نے جب ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں الازہر یونیورسٹی کا ریاست وزعامت سنبھالی اسی دوران آپ نے شیخ محمود شلتوت کا ایک مقالہ مطالعہ فرمایا اور ان کے گہرے افکار، عربی ادبیات پر تسلط اور قلم وبیان پر ان کے غلبہ کا اندازہ ہوا۔ اس لئے شلتوت کو الازہر یونیورسٹی کے اعلیٰ کلاسوں میں تدریس کی دعوت دی اس زمانہ میں شیخ شلتوت اسکندریہ کالج میں طالب علموں کی تعلیم وتربیت میں مشغول تھے شیخ فراغی کے دعوت نامہ پر لبیک کہتے ہوئے قاہرہ کا سفر اختیار کیا اور الازہر یونیورسٹی کے سطوح عالیہ کے استاد بن گئے۔

پے درپے آپ کی کامیابیاں اس بات کا سبب بنیں کہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں الازہر یونیورسٹی کے خصوصی مرحلہ کے مدرس کا مرتبہ ودرجہ پر چنے جائیں۔

اساتید

شیخ شلتوت نے بہت سے اساتذہ کے محضر سے کسب فیض کیا ہے لیکن تین اساتید کی آپ کی تربیت تعلیم میں بہت بڑا کردار رہا ہے۔

۱۔استاد شیخ الجیزاوی: آپ اسکندریہ یونیورسٹی میں شیخ شلتوت کے استاد تھے۔

۲۔شیخ عبدالمجید سلیم: شیخ سلیم ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۳/اکتوبر ۱۸۸۲ء کو مصر میں پیدا ہوئے مقدماتی تعلیم کا مرحلہ ختم کرنے کے بعد الازہر یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور وہاں سے ۱۳۳۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے تعلیم مکمل کرنے کے بعد قاضی، آپ نے مدرس اور ہیئت فتویٰ کے رکن کی حیثیت سے کام کیا آپ کا شمار شیخ محمد عبدہ کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔

شیخ عبدالمجید سلیم، جماعت تقریب بین مذاہب کے موسسوں میں سے ایک اور اس تنظیم کے سرگرم رکن تھے آپ کی خاص صفت صراحت اور شجاعت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ ۱۳۶۸ھ میں حکومت الازہر یونیورسٹی کے امور میں مداخلت کر رہی ہے تو آپ نے بے نظیر صریحی اقدام کرتے ہوئے الازہر کی ریاست و زعامت سے استعفاء دے دیا۔ دربار شاہ کا رئیس دیوان جو آپ کے اس اقدام سے بے حد ناراض تھا عبدالمجید سلیم کو دھمکی دے بیٹھا اور بولا: اس اقدام سے ان کو بہت سے خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شیخ سلیم نے کمال شجاعت و صراحت کے ساتھ جواب دیا کہ جب تک میں اپنے گھر اور مسجد کے درمیان حرکت کر رہا ہوں مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ (بی آزار شیرازی ۱۳۷۹ش، ص/۲۴)

شیخ سلیم نے تقریب اور اسلامی اتحاد کے میدان میں برسوں سعی و کوشش کے بعد ۱۰/صفر ۱۳۷۴ھ بروز پنج شنبہ اس دار فانی کو الوداع کہا۔ (خفاجی، ج/۱ص/۳۰۶)

۳۔شیخ محمد مصطفیٰ مراغی: شیخ مراغی ۱۳۰۳ھ مطابق مارچ ۱۸۸۱ء شہر مراغہ میں پیدا ہوئے جو مصر کے سوہاج اسٹیٹ کا تعلقہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد قرآن مجید حفظ کرنے میں مشغول ہوئے اور بڑی مختصر مدت میں حافظ قرآن بن گئے۔ آپ شیخ محمد عبدہ کے شاگردوں اور مریدوں میں سے تھے اور ان کے افکار سے متاثر ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے تھے۔

رشید رضا نے آپ کے بارے میں لکھا ہے: آپ شیخ محمد عبدہ کے خالص ترین بھائیوں اور مریدوں میں

سے تھے۔ (بی آزار شیرازی ۱۳۷۹ اش، ص ۲۴)

جس وقت محمد عبدہ نے سوڈان کا سفر کیا تو انھیں اپنے ساتھ لے گئے اور آپ وہاں مقدمات کے فیصلہ میں مشغول ہوئے شیخ شلتوت اپنے اس استاد کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں۔ شیخ محمد مراغی کے پاس جو کچھ علم عقل وافکار تھے وہ سب جناب محمد عبدہ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے تھے۔

مجمع دار التقریب کے رئیس جناب محمد تقی قمی ان کے بارے میں لکھتے ہیں: آپ (شیخ مراغی) باوقار وباشخصیت کے انسان تھے اور بڑی منظم اور وسیع فکر ونظر کے مالک تھے۔۔۔ آپ بڑے فعال تھے اور اشخاص کے درمیان تعلقات بنانے اور بنیادی نقاط پر اتفاق رائے پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ رکھتے تھے انھوں نے بہت سے علماء و بزرگان دین کہ جن میں سرفہرست شیخ مصطفیٰ عبد الرزاق اور شیخ عبد المجید سلیم تھے کہ لئے ماحول سازگار کیا۔ (بی آزار شیرازی ۱۳۷۹ اش، ص ۶۵)

شیخ مراغی نے بہت سے علمی آثار قرآن اور اسلامی معارف کے میدان میں چھوڑے ہیں کہ جن میں سے ایک ''الاولیا والمحجورین'' ہے جس میں قرآن کے ترجمے، لغوی ابحاث اور سورہ لقمان، حجرات، حدید، عصر وغرہ کی تفسیر پر مشتمل دروس ہیں۔ (احمدی ۱۳۸۳ اش، ص ۵۴)

آپ نے ماہ رمضان ۱۳۶۷ ھ میں اس دار فانی کو الوداع کیا اور آپ کے جنازہ کو عظیم الشان تشیع کے بعد بی بی سیدہ نفیسہ کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ (مجاہد، ۱۹۹۴ء ج ۱ ص ۴۰۰)

شاگردان

۱۔ عباس محمود عقاد

عباس محمود عقاد، شاعر، مجدد، نقاد اور مصر کے معروف ومشہور خبر نگار نے ۱۳۱۱ ھ مطابق ۱۸۸۹ء میں شہر اسوان میں آنکھ کھولی، آپ کا اصلی پیشہ خبر نگاری تھا لیکن شعر گوئی میں بہت ماہر تھے آپ کے اکثر آثار جن میں آپ کا دیوان شعر، وحی الاربعین، ہدیۃ الکروان اور عابر ان السبیل، شعر وشاعری کے میدان میں اور دو کتاب عبقریۃ محمد اور عبقریۃ عمر، اسلامی شخصیات کے سلسلہ میں تالیف کی ہے۔ (المنجد فی الاعلام، ص ۴۷۱)

۲۔ شیخ علی عبد الرزاق

الازہر یونیورسٹی سے استعفاء

شیخ مصطفیٰ مراغی مصمم تھے کہ الازہر میں اپنے اصلاحی پروگراموں کو عملی جامہ پہنائیں۔ اسی لئے مصری حکومت کی توجہ مبذول کرانے کے لئے اپنا اصلاحی لائحۂ عمل حکومت وقت کو پیش کیا اور شیخ شلتوت نے بھی کئی مقالہ لکھ کر شیخ مراغی کے پروگراموں کی حمایت کی اور ان کے اصلاحی لائحۂ عمل کو الازہر یونیورسٹی کی علمی ثقافتی حالت کے بہتر بنانے کی راہ میں موثر اقدام قرار دیا۔

فاسد اور مغرب سے وابستہ مصری حکومت نے اس لائحہ کی مخالف کی لہٰذا شیخ مراغی نے اعتراض کے طور پر الازہر یونیورسٹی کی ریاست وزعامت سے استعفاء دے دیا۔ مصری حکومت نے آپ کا استعفاء قبول کرتے ہوئے شیخ محمد ظواہری کو الازہر یونیورسٹی کا نیا رئیس چن لیا انھوں ں نے الازہر کی قیادت وزعامت سنبھالتے ہی درباری پروگراموں کو اجرا کرنا مشروع کر دیا۔ لیکن زندہ دل علماء کی مخالفت سے روبرو ہوئے۔ ظواہری نے اپنے کو مخالفین کے موج مارتے سمندر کے روبرو دیکھ کر اس مخالفت کے اصلی عوامل کو معزول کر دیا جن میں شیخ شلتوت بھی تھے جنھیں ۱۳۵۲ھ میں اپنی پوسٹ سے برخاست کر دیا گیا۔

آپ معزولی کے بعد بے کار نہیں بیٹھے اور اپنے شاگرد شیخ علی عبدالرزاق کے ساتھ شرعی محکمہ میں وکالت اور اخبار کے کالم نویسی میں مشغول ہو گئے آپ اپنے اصولی و بنیادی موقف سے ذرہ برابر پیچھے نہیں ہٹے اور اپنے مقالوں میں الازہر کے اندر اصلاحات کی ضرورت پر تاکید کرتے رہے۔

الازہر کے ذمہ داروں کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ بزرگ اساتذہ جیسے شلتوت کے نہ ہونے سے الازہر یونیورسٹی کی حیثیت پر حرف آرہا ہے لہٰذا ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں دوبارہ آپ کو الازہر میں تدریس کی دعوت دی گئی اس طرح آپ اسی سال دوبارہ الازہر کے شریعت کالج میں پڑھانے لگے۔

علمی طمغے

شیخ محمود شلتوت اپنی علمی وفکری زندگی میں کئی بار اعزاز وقدردانی سے نوازے گئے بطور نمونہ آپ شیلی یونیورسٹی سے ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں اور جاکارتہ یونیورسٹی سے ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹری کی سند سے نوازے گئے۔ (خفاجی، ج ۳ ص ۴۴۴)

الازہر کی ریاست وزعامت

مصر کی موجودہ حکومت نے شیخ مراغی کو دوبارہ ۱۹۳۷ء میں الازہر یونیورسٹی کی ریاست سونپ دی اور شیخ

شلتوت کی لیاقت وصلاحیت نیز شیخ مراغی کا آپ سے بے پناہ تعلق باعث بنا کہ شیخ مراغی نے شیخ شلتوت کو شریعت کالج کا نائب منتخب کرلیا۔

شیخ مراغی نے ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۵۷ء شیخ شلتوت کو الازہر یونیورسٹی کا نائب مقرر کیا۔ شیخ محمود شلتوت ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۱ء کو اس وقت کے صدر مملکت کی جانب سے الازہر یونیورسٹی کے رئیس وزعیم کے طور چنے گئے اور آپ نے الازہر کی اپنی زعامت وریاست کے دوران الازہر یونیورسٹی اور اسلام کے لئے بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

الازہر یونیورسٹی کے اندر آپ کے اہم ترین پروگرام ایک اہم تفرقہ ومذہبی تعصب سے دوری ہے، جس وقت آپ سے ایک خبر نگار نے پوچھا: الازہر یونیورسٹی کا نئے دور میں اہم ترین مقصد اور ذمہ داری کیا ہے؟ شیخ شلتوت نے جواب دیا: میرے پروگرام میں بنیادی اور اہم مقصد تعصّبات سے جنگ، پاک وصاف اور بھائی چارہ کی فضا میں دینی علوم کی تحقیق نیز ایسی بہترین راہ کی تلاش جس کے ذریعہ دین وایمان کے درمیان روابط کو مستحکم سے کیا جاسکے اور قوی ترین دلیل کی پیروی چاہے وہ جس افق سے چمکے۔

اگر مسلمین ان مطالب کو عملی جامہ پہنا سکیں تو ایسی بڑی طاقت بن سکتے ہیں کہ بڑی آسانی وفارغ البالی کے ساتھ اپنی عظمت وشان کو بلند وبالا کرسکتے ہیں۔ گزشتہ ادوار میں تعصب کے باعث پیدا ہوئی مشکلات کے بوجھ سے نجات پاسکتے ہیں اور مختلف جسموں ایک روح کی حیثیت سے کائنات میں جلوہ نمائی کرسکتے ہیں۔ (بی آزار شیرازی ۱۳۷۹ش، ص/۳۵۵، جمہوری اسلامی ۱۹/۱۰/۷۹ و یژہ نامہ ص/۱۰)

آپ کے اہم ترین اقدامات میں سے ایک سنی فقہ کے پہلو میں شیعہ فقہ کی تعلیم تھی جو آپ نے اپنی ریاست وزعامت الازہر کے دوران کئے ہیں۔ آپ اس سلسلہ میں خود فرماتے ہیں: ''یہ الازہر یونیورسٹی ہے جہاں اسلامی مذہب کے درمیان تقریب کی بنیاد پر طے پایا ہے کہ شیعہ اور سنی فقہ بغیر کسی تعصب کے دلیل وبرہان کی بنیاد پر بڑھائی جائے۔ (جمہوری اسلامی ۱۹/۱۰/۷۹، و یژہ نامہ، ص/۱۰)

الازہر میں مراسم عاشوراء کا انعقاد

اپنی ریاست الازہر کے دوران شیخ شلتوت کے کارناموں میں سے ایک عاشور کے دن الازہر یونیورسٹی کے صحن میں مراسم عاشوراء کا انعقاد ہے اور یہ امر شیخ شلتوت کے حضرات اہلبیت علیہم السلام خاص طور سے حضرت

امام حسین علیہ السلام کے ساتھ خصوصی عشق ومحبت کی غمازی کرتا ہے۔ استاد محمد واعظ زادہ خراسانی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: شیخ شلتوت کی زعامت وریاست کے دوران مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عاشور کے دن الازہر کے ہال میں مجلس عزاداری برپا ہوئی اور اس موقع پر ایران کے اخباروں نے اس خبر کو نشر کیا۔ (روزنامہ اطلاعات، ۱۳۰/۴/ ۱۳۷۴، ویژنامہ، ص/۱۴)

علمی کاوشیں

ا۔تحقیقات اسلامی اکیڈمی

اس موسسہ میں کہ جس کی شیخ شلتوت نے بنیاد رکھی تھی تمام اسلامی مذاہب کے نمائیندے جمع ہوتے تھے اور مختلف اسلامی موضوعات پر بحث وگفتگو کرتے تھے۔ (مردم ودین، ص/۱۶)

۲۔ہالینڈ کانفرنس میں شرکت

شیخ محمد شلتوت کو بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کرنے کی دعوت دی گئی جو کہ ہالینڈ کے شہر''لاھہ'' میں منعقد ہوئی آپ نے اس کانفرنس میں الازہر یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔

شیخ شلتوت نے اس کانفرنس میں ایک مقالہ جس کا عنوان تھا''المسؤولیۃ المدنیۃ والجنائیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ'' پیش کیا آپ کا مقالہ علمی وادبی اعتبار سے بہت اونچی سطح کا مانا گیا اور کانفرنس کے اراکین نے اسے بہت پسند کیا۔ کانفرنس کے آخر میں آپ کے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر مقالہ کو مثالی مقالہ کے طور پر انتخاب کیا گیا اور طبع بھی ہوا۔

۳۔ریڈیو کے تفسیری کمیشن میں رکنیت

اس کمیشن کی ذمہ داری مصر کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے قرآن کے تفسیری پروگراموں پر نظارت کرنا تھا۔ شیخ شلتوت اس کمیشن کے فعال رکن تھے آپ ہی کی تجویز پر ہر روز صبح تلاوت قرآن سے پہلے اور بعد میں ایک پروگرام''صبح کی گفتگو'' کے عنوان سے نشر ہوتا تھا جس میں تفسیری بحث پیش کی جاتی تھی۔

۴۔الازہر کی فتویٰ کمیٹی کی رکنیت

اس کمیٹی کی اہم ترین ذمہ داری فقہ کے مختلف میدانوں میں سماج کی ضرورتوں کے پیش نظر فتویٰ صادر کرنا تھا۔

۵۔صف اول کے مصری علماء کی انجمن کی رکنیت

جس وقت شیخ شلتوت اس انجمن کے رکن بنے، آپ اراکین میں سب سے کم عمر تھے، لیکن کمسنی کے باوجود اس انجمن کے پہلے ہی جلسہ میں شلتوت نے اتنی اہم تجاویز پیش کیں کہ رئیس انجمن جناب شیخ عبدالمجید سلیم نے شلتوت کی تجاویز پر عمل درآمد کا حکم صادر کر دیا۔

۶۔مغربی جرمنی میں موقت شادی (متعہ) کے سلسلہ میں شیخ شلتوت کے نظریات

مغربی جرمنی کی حکومت نے ایک خط لکھ کر الازہر یونیورسٹی کے رئیس سے مانگ کی کہ اسلام میں تعدد ازدواج کے بارے میں مکمل تحقیق لکھ کر حکومت کے پاس بھیج دیں تاکہ شاید اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ملک میں عورتوں کی مردوں کے اوپر کثرت کا مسئلہ حل کیا جاسکے۔ شیخ شلتوت نے بھی اس مسئلہ پر بحث کا آغاز کیا آپ کی بحثوں کا مجموعہ تین زبان (انگریزی، فرانسیسی، جرمن) میں ترجمہ ہوا ان دنوں بعض اخبار نے لکھا کہ شیخ شلتوت کی بحث وہ اولین بحث ہے کہ جو جرمنی میں عورتوں کی کثرت اور ان کی شادی کا مسئلہ حل کر دے گی۔ (مکارم شیرازی، اسفند ۱۳۳۸، ص ۴۴)

۷۔مصر کے ادبستان زبان عربی میں رکنیت اور شلتوت کے اقدامات

شیخ محمود شلتوت نے ۱۵ خرداد ۱۳۴۲ ش کے حادثہ کے چھٹے دن ایک خط لکھ کر دنیا بھر کے مسلمانوں سے مانگ کی کہ ایران کے مجاہد علماء جو کہ حق کا دفاع کرنے کے جرم میں زندانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں ان حمایت کریں۔ انھوں نے اس عمومی خط میں علماء کی گرفتاری اس کی مقدس شخصیت کی توہین کو جبین بشریت پر بدنما داغ قرار دیتے ہوئے شاہ کے نام ایک ٹیلی گراف میں رسمی طور پر اسے علماء اسلام اور روحانیوں پر جارحیت سے باز رہنے کا حکم دیا اور شاہ سے مانگ کی کہ فوری طور پر علماء اور عام گرفتار شدہ مسلمانوں کو آزاد کرے۔

خط کا مضمون

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هذا بيان للناس ...

اس دور میں بدترین پروپیگنڈے اور آشکار ظلم و جارحیت ہو رہی ہے کہ جس میں ایران کے اسلامی علماء قربان ہو رہے ہیں وہ بہادر لوگ جو راہ خدا کی دعوت دے رہے ہیں اور اپنے دین و مذہب کی حفاظت کر رہے ہیں۔

ان کا اس کے علاوہ کوئی جرم نہیں ہے کہ وہ اسلامی والٰہی تعلیمات کو پھیلا رہے ہیں۔ ایران کے علمائے اسلام اور روحانی بارہا حکومت کے ظلم وستم کا شکار ہو چکے ہیں اور متعدد مرتبہ گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ انھیں امر بالمعروف، جو ہر غیر عاجز مکلّف پر واجب ہے اور نہی عن المنکر، جس کی ذمہ داری تمام غیر عاجز انسانوں پر واجب ہے، سے روکا جا رہا ہے جب کہ ان دونوں فریضوں کی ادائیگی میں جو بھی فوائد وخیر وصلاح ہے وہ امت اسلامی کو حاصل ہوتی ہے اور جس کے مبارک نتائج قوم کو ملتے ہیں کیوں کہ ہر قوم وملت کی حیات کے اخلاق وتمدن سے وابستہ ہے اور خلاصۂ اخلاق کو دین خدا نے احکام وآداب وتعلیمات کے مجموعہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس اخلاقی کمال ترقی ورشد کے علمبردار معنویت وروحانیت کی قیادت ورہبری اور اس میں موثر کردار ادا کرنے والے ہر قوم وملت کے علمائے اخلاق ہیں جو اپنی تبلیغات اور ہدایت ورہنمائی کے ذریعہ اس قوم وملت کی معنوی ترقی وتکامل کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔

ہوشیار! میں تمام مسلمانوں کو آگاہ کرتا ہوں تمامی ممالک کے مسلمانوں اور ایران کی مسلمان قوم کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس ظلم وستم اور بے شرمانہ دست درازی وتعدی کو سطحی نظر اور سادگی سے نہ دیکھئے اور اپنی بھرپور طاقت سے ایران علماء کو وہاں کے ڈکٹیٹر جلاد کے جنگل سے نجات دلانے کے لئے جہاد کریں۔ ''**ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون الله من اولیاء ثم لا تنصروان**'' جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے پشت پناہ نہ بنو ورنہ آتش جہنم تمھیں دبوچ لے گی اور خدا کے مقابلہ میں کسی کو مددگار نہ پاؤ گے اور کوئی بھی تمھاری مدد کو نہ آئے گا۔

۸/محرم ۱۳۸۳ھ محمود شلتوت، شیخ الازہر

(روحانی، زیارتی، ج/۱ص/۵۳۲)

اسرائیل کو قانونی حکومت تسلیم کرنا

امریکہ اور انگلینڈ کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ۹/۸/۱۳۲۶ش مطابق با ۲۹/نومبر ۱۹۴۷ء) میں مقدس سرزمین فلسطین کے دو ٹکڑے مسلمان نشین علاقہ اور یہودی نشین علاقہ کر دینے پر مبنی تجویز کو پاس کر دیا اور اس کے پانچ مہینہ بعد اسرائیلی حکومت کی بنیاد پڑی پھر بعض ملکوں نے اسرائیل کی غاصب حکومت کے قانونی ہونے کو رسمی طور پر تسلیم کر لیا۔

محمد رضا شاہ ایران نے جو کہ امریکہ اور انگلینڈ کا بے چوں چرا نوکر تھا اور اپنی بقاء ان دونوں کی نوکری میں سمجھتا تھا اسرائیلی حکومت کو قانونی مان لیا اور بیت المقدس میں اپنی کا ؤنسلٹ بنالی۔ اس خبر کے نشر ہوتے ہی ایران کے اندر اور باہر کے بیدار علماء اور روشن خیال دانشوروں نے اس بے شرمانہ عمل پر کھل کر اعتراض کیا۔ ایران کے مذہبی پیشوا آیت اللہ کاشانی نے اس بے شرمی کے خلاف سخت موقف اختیار کرتے ہوئے بڑی سخت تقریر فرمائی۔ عرب دنیا میں بھی شاہ ایران کے اس نفرت آمیز عمل کے خلاف ردعمل ظاہر کیا گیا اور مسلم علماء نے اس موضوع کے سلسلہ میں اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

شیخ محمود شلتوت نے بھی اسرائیل کے ساتھ اسلامی ممالک کے کسی قسم کے تعلقات کو رد کرتے ہوئے ایرانی حکومت کے اقدام کی مذمت کی اور اس سلسلہ میں قم آیت اللہ بروجردی کے پاس ٹیلی گراف بھیجا جس کا مضمون اس طرح تھا۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

ہمارے اور آپ کے تمام بھائیوں، ایران کے شفیق علماء اور ان تمام لوگوں پر خدا کا درود وسلام ہو جو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کی حفاظت اور ان کے باہمی اتفاق کا دفاع کرتے ہیں۔

امابعد! یقیناً جناب عالی اور تمام بزرگ بھائیوں نے ان دنوں نشر ہونے والی رنج و غم سے بھری خبر کو سنا ہوگا۔ یہ سنا ہوگا کہ شاہ ایران نے اس اسرائیل کو قانونی طور سے مان لیا ہے۔ جس نے فلسطین کی سرزمین پر تجاوز کیا ہے اور وہاں کے لوگوں کو آوارہ اور ان کے حقوق کو غصب کر لیا ہے۔

دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کے لئے افسوس کا باعث ہے کہ جو بادشاہ خود بھی اور اس کی قوم مسلمان ہے مسلمانوں کے دشمنوں کی تائید کرے اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے۔ ہم نے دو بار بادشاہ کے پاس ٹیلی گراف بھیجا ہے اور یہ ذہن نشین کرا دینا چاہا ہے کہ یہ کام ان لوگوں کے لئے بہانہ بن جائے گا جو ہمارے درمیان تعلقات ختم کرنے کے درپے ہیں جن روابط و تعلقات کو تقویت پہنچانے کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں۔

یقیناً آپ حضرات بھی اس اقدام سے متاثر ہوں گے اور اس کی مذمت کے لئے بھرپور کوشش کریں گے اور یہ طے ہے کہ حضرت عالی کا اقدام بڑا بہترین اثر چھوڑے گا میں آپ کے خط کا منتظر ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا بھائی محمود شلتوت شیخ الازہر (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۰ش، ص ۲۶۲)

افسوس کہ شیخ شلتوت کا ٹیلی گراف اس وقت قم پہنچا جب کہ آیت اللہ بروجردی بستر بیماری پر تھے اور اسی بیماری میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس کی نزاکت کے پیش نظر شیخ محمود شلتوت نے اپنی ذمہ داری سے شانہ خالی نہ کیا اور ایک خط ایت اللہ العظمیٰ محسن حکیم (متوفی ۱۳۹۰ق) کو ارسال کیا اور آپ سے درخواست کی کہ اس سلسلہ میں کوئی اقدام فرمائیں۔

یہ دو خط شیخ شلتوت کی طرف سے ارسال ہوئے جن کے اندر چند بڑے اہم اور بنیادی نکات قابل دید ہیں۔

۱۔ سرزمین قدس کی آزادی کے لئے آپ کی سعی و کوشش اور اہتمام۔

۲۔ حکومت اسرائیل کی کسی بھی شکل وصورت میں حمایت کرنے والوں کا مقابلہ۔

۳۔ شیعہ علماء سے اچھے وخوشگوار تعلقات جو کہ خطوط کے لہجہ سے یہی ظاہر ہے۔

۴۔ اسلامی دنیا میں اور مسلمانوں پر پوری کائنات میں پڑنے والی افتاد کے سلسلہ میں مسلسل شیعہ علماء سے رابطہ اور مشورہ حضرت آیت اللہ محسن حکیم نے خط کو پاتے ہی ایک ٹیلی گراف تہران میں آیت اللہ سید علی بہبہانی کو بھیجا اور ان کے پاس ساری باتیں لکھ دیں آیت بہبہانی نے شاہ کو علمائے دین اور مراجع تقلید کی ناراضگی سے آگاہ کیا۔

اتحاد آمیز تفکرات

بیشک شیخ محمود شلتوت ان گنے چنے چند علماء میں سے ایک تھے جنھوں نے اسلامی اتحاد پر خاص توجہ دی ہے ان کے خیال میں اتحاد کے عملی ہونے کا ایک اہم ترین مسئلہ، مشترک نقطوں کی حصول یابی ہے جن پر تمام مذاہب متفق ہیں تمام اسلامی مذاہب کا مشترک نقطہ قرآن مجید ہے شیخ شلتوت اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: اسلام نے لوگوں کو اتحاد واتفاق کی دعوت دی ہے اور جس محور ومرکز سے تمام مسلمین کو متمسک ہونا اور اس کے اردگرد جمع ہونا وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور یہ بات قرآن مجید کی کئی آیتوں میں آئی ہے۔ جن میں سب سے زیادہ واضح آیت سورہ آل عمران کی یہ آیت ہے" واعتصموا بحبل الله جميعا و لا تفرقوا "اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مطلقا طور پر تفرقہ سے منع کر دیا ہے جو تعصب کے سبب پیدا ہونے والے تفرقہ کو بھی شامل ہے صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ" لا عصبية فى الاسلام "دین اسلام میں تعصب نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ (روزنامہ جمہوری اسلامی، ۱۹/۱۰/۷۹،

ویژہ نامہ ص/۹)

شیخ شلتوت دوسری جگہ پر خدا کی کتاب قرآن اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو تمام مذاہب کے درمیان مشترک پہلو سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''تفرقہ سے ممانعت، مذہبی تفرقہ کو بھی شامل ہے کیوں کہ اگر چہ اسلام میں فقہی مذاہب بہت رہے ہیں ان کی روش بھی جداگانہ ہی ہے پھر بھی سب نے ایک ہی اصول یعنی کتاب خدا اور سنت رسول خدا کو محور بنایا ہے لیکن ان اختلافات اور فقہی تعدد کے باوجود سب کے سب نقطۂ مشترک اور واحد کلام پر جمع ہوتے ہیں جو مصادر اصلی پر ایمان ہے یعنی کتاب خدا اور سنت رسول کی عظمت و تقدس کا اعتراف و ایمان ۔ (روزنامہ جمہوری اسلامی، ۱۹/۱۰/۷۹، ویژہ نامہ ص/۹)

اتحاد آفرین اسباب

ا۔ترک تعصب

ایک نامہ نگار نے شیخ شلتوت سے پوچھا: اتحاد کو استوار و پائیدار کرنے والے عوامل و اسباب کیا ہیں؟
شیخ شلتوت نے جواب میں فرمایا: پہلا عامل ترک تعصب اور عدالت و انصاف کی رعایت کرنا ہے اور یہ عامل دیگر عوامل اور شروط کے متحقق ہونے میں مدد کرتا ہے کہ جن میں سے ایک اسلامی کلچر کی طرف جھکاؤ اور ہر ایک کے نظریات سے استفادہ کرنا ہے اس راہ میں کتابیں، رسائل و مجلّات چھپنے چاہئیں تبادلہ خیال اور افکار و آراء کا مبادلہ ہونا چاہئے، علمی موسسات و مراکز اور یونیورسٹیوں کو ایک دوسرے سے آشنا ہونا چاہئے طلاب اور اساتید کی رفت و آمد اور مختلف امور میں رائے مشورہ اور ملاقاتیں ہونا چائیں اور بھائی چارہ کے ماحول میں مشکلات کا حل تلاش کیا جانا چاہئے ۔مسلمانوں کے درمیان محبت آمیز تعلقات کو تقویت ملنی چاہئے جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

''اگر امت مسلمہ کے کسی ایک عضو میں درد اٹھے تو دوسرے اعضاء کو چین نہیں ملنا چاہئے'' (روزنامہ جمہوری اسلامی، ۱۹/۱۰/۷۹، ویژہ نامہ ص/۱۰)

شیخ شلتوت علمی مراکز اور علمی اداروں میں پائے جانے والے علمی اختلافات اور عوام الناس میں پائے جانے والے خشک تعصب میں فرق کے قائل تھے وہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں ''رائے و نظر میں اختلاف معاشرتی ضرورت اور ایک طبیعی امر ہے جس سے اجتناب ناممکن ہے، لیکن مذہبی تعصّبات اور فکری انجماد یہ مسئلہ بڑا فرق رکھتا

ہے۔تعصب، مسلمانوں کے درمیان رشتہ الفت ومودت کوتوڑ کر رکھ دیتا ہے اور دشمنی وکینہ کی آگ دلوں میں بھڑکا دیتا ہے۔لیکن حقیقت کی تلاش وجستجو کے سبب وجود میں آنے والا اختلاف دوسروں کے اراء ونظریات کے احترام اور مخالفین کے نظریات وتفکرات کے احترام کے ساتھ قابل تعریف اور قابل قبول ہے۔ (روزنامہ جمہوری اسلامی، ۱۹/۱۰/۹۷، ویژہ نامہ ص/۱۰)

ایک اور مقام پر اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں: ہرگز کسی کے ذہن میں یہ خیال وتصور نہیں پیدا ہونا چاہئے کہ وہ مطلق حقیقت اور ناقبل تبدیل حقیقت پر دسترس پیدا کر چکا ہے اور دوسروں پر لازم ہے کہ اسی کی پیروی کریں۔ بلکہ اسے چاہئے کہ کہے میں نے جو تحقیق کے بعد حاصل کیا ہے وہ میری تحقیقات کا نتیجہ اور میری کوششوں کا ماحصل ایک نظریہ یا عقیدہ ہے۔ میں اس سلسلہ میں کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ بغیر کسی بنیاد و دلیل کے میری پیروی کرے بلکہ اسے چاہئے تحقیق وتلاش کرے تا کہ میری رائے وعقیدہ کا مدرک پا جائے اس وقت اگر دلیل محکم مل جائے تو میری تائید کا باعث ہے۔(مردم ودین، ص/۱۴)

۲۔علماء دین کا کردار

ہر مذہب و دین کے علماء و بزرگ افراد اس دین کے اہداف و مقاصد کی ترقی میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں اگر علمائے اسلام بھی اپنی تمام تر کوششوں کو مسئلہ اتحاد اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ سے دشمنان اسلام کے سوٗاستفادہ نیز تفرقہ کے خطرات سے لوگوں کو آگاہ کرنے میں مبذول کریں تو اسلامی یکجہتی وقوع پذیر اور اسلامی دنیا، عالم کفر کے مقابلہ میں متحد ہو سکتی اور ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی ہے۔

شیخ شلتوت اسلامی اتحاد کے سلسلہ میں ممتاز علماء کے کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سب کو اتحاد و اخوت کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں: میں ایک بار پھر تمام شیعہ وسنی علماء کو خدا کے نام پر رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نام پر، اسلامی اتحاد کے نام پر، اللہ کی محکم رسی سے تمسک کے نام پر تقریب اور اتحاد و اتحاد کی دعوت دیتا ہوں۔

یہ امر مسلم ہے کہ جو اس مقدس مقصد کی طرف جلدی سے آئے گا خدا کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت ومحترم ہوگا اور وہ شگاف جو کہ سابق ادوار میں مسلمانوں کے درمیان ایجاد ہوئے ہیں انھیں دیکھے اور ہمارے شعار اور ہماری عظمت یعنی اسلامی اتحاد کو ہمیں واپس دلائے۔(بی آزار شیرازی، ۱۳۷۹ش، ص/۱۸۲)

دشمن کا غلط فائدہ اٹھانا

سامراج اور دنیائے استکبار کی سازشوں میں سے ایک اسلامی معاشروں میں اختلاف اور پھوٹ ڈالنا ہے تا کہ اس اختلاف اور کشمکش سے فائدہ اٹھا کر اپنے ننگین مفادات کو حاصل کرلیں اور مسلامن قوموں کے مفادات اور دولت وثروت کو تاراج کردیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف سے جتنا استکبار کے حکام خوش ہوتے ہیں اتنا کوئی خوش نہیں ہوتا علامہ شیخ شلتوت مسلمانوں کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اللہ سبحانہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ سے اتحاد نظر اور اتحاد واتفاق کا مطالبہ کیا ہے اور پارٹی بازی، گروہ بندی وغیرہ سے جس سے ان کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے کیوں کہ استعماری ممالک نے مسلمانوں کے اختلافات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔(اخبار تقریب، ش/۴۹و۵۰، ص/۱۴)

استکباری طاقتیں کبھی اس بات سے خوش نہ ہوں گی کہ امت اسلامی متحد ہو جائے کیوں کہ انھیں پتہ ہے کہ امت اسلامیہ متحد ہو کر ان کے مفادات کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور انھیں اجازت نہ دے گی کہ امت اسلامیہ کے مفادات اور مال وثروت کو تاراج کرسکیں۔ بنابریں وہ کسی بھی سعی وکوشش کے مقابلہ میں جس سے امت کے درمیان اتحاد واتفاق پیدا ہوسکتا ہے ڈٹ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مرحوم میرزا خلیل کمرہ ای، شیخ شلتوت سے متعلق ایک واقعہ نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

میں نے ایک وفد کے ساتھ دو مرتبہ مصر کا سفر کیا اور دونوں مرتبہ جامعۃ الازہر کے رئیس وزعیم شیخ محمود شلتوت سے ملاقات کر چکا ہوں، ایک مرتبہ جامعۃ الازہر کے اندر اور دوسری مرتبہ ان کے ذاتی مکان پر اس خصوصی ملاقات میں شیخ الازہر نے کچھ حقائق سے ہمیں آگاہ کیا اور ایک ایسا راز فاش کیا جس سے مشرقی ممالک کے اندرونی معاملات میں (بلکہ اسلامی مذاہب کے سلسلہ میں اجنبیوں کی مداخلت کا پتہ چلتا ہے مصر کے عظیم رہنما شیخ شلتوت نے فرمایا: میں نے بہت پہلے تقریباً تیس سال قبل فقہ امامیہ کا مطالعہ کرنا چاہا اور ایران وعراق سے شیعہ امامیہ کی فقہی کتابیں منگانا چاہیں لیکن جب تک مصر، استعمار کے جنگل سے آزاد نہیں ہوا کتابیں نہ مل سکیں اور سینسر ہوتی رہیں۔ یہاں تک سویز کمینال کے فتح ہونے کے بعد آپ لوگوں (شیعوں) کی کتابیں مجھے دستیاب ہوئی اور میں نے ان کا

مطالعہ کیا اور مجھ پر حجت تمام ہوگئی اور وہ فتویٰ (شیعہ فقہ کی پیروی جائز ہے) دیا جس میں کسی صاحب منصب ومقام یا کسی کے کے کلام سے متاثر نہیں ہوا۔(بی آزار شیرازی، ۱۳۷۹ش، ص/۱۹۵، بنقل از رابطہ عالم اسلام، ناصر الدین کمرہ ای، ص/۷)

دار التقریب میں شیخ شلتوت کا کردار

جماعت تقریب مذاہب اسلامی، مصر کے شہر قاہرہ میں ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں اسلامی مذاہب کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی غرض سے تاسیس ہوئی جس کے موسسین علامہ محمد تقی قمی، شیخ محمود شلتوت، شیخ محمد مصطفیٰ مراغی، مصطفیٰ عبدالرزاق، عبدالمجید سلیم تھے۔

یہ جماعت بعد میں ختم ہوگئی اور ایران میں مذکورہ مقصد کے تحت بنام ''مجمع تقریب مذاہب اسلامی'' کی تاسیس ہوئی یہ جمعیت اسلامی مذاہب کے درمیان تقریب کے مرحلہ میں بہت سے خدمات انجام دے چکی ہے۔

علامہ شلتوت اس تنظیم کی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں: یہ تحریک ''تنظیم دار التقریب کہ جس کی بنیاد مختلف اسلامی مذاہب کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے رکھی گئی۔کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ دنیا بھر میں علمی اور حقائق پر استوار تنظیم شمار ہونے لگی۔اسی طرح اس پر مسلمانوں کے درمیان اصلاح پاسندی، محبت و برادری کی روح سایہ فگن ہوگئی۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کلام خدا کو محقق کرنا اس کا اصلی مقصد ہے کہ جس میں ارشاد ہوتا ہے: صرف صاحبان ایمان آپس میں برادری و بھائی چارہ قائم کرتے ہیں، لہٰذا تم بھی بھائیوں کے درمیان صلح قائم کرو اور خدا سے ڈرو ہوسکتا ہے، اس کی رحمت تمھارے شامل حال ہوجائے۔(مردم و دین، ص/۹)

شیخ شلتوت دار التقریب کی فضا کو دوستی و برادری کی فضا سمجھتے ہیں، وہ فرماتے ہیں'' اس ''دار التقریب میں'' مصری، ایرانی، لبنانی، عراقی اور پاکستانی کے ساتھ بیٹھتا ہے اور ہر ایک کی آواز گونجتی ہے۔وہاں شافعی اور حنبلی، شیعی و زیدی کے ساتھ ایک میز پر بیٹھتا ہے۔وہاں علم، اخلاق، تصوف، فقہ اور دیگر ساری بحثیں ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ وہاں ہر چیز کے اوپر برادری، مہربانی، دوستی، حق کی تلاش و۔۔۔کی روح حکم فرما ہے۔(مردم و دین، ص/۱۶)

شیخ محمد تقی قمی جو کہ خود بھی دار التقریب کے بانیوں میں سے ہیں شیخ محمود شلتوت کے بے نظیر کردار کے بارے میں لکھتے ہیں: ''جن دنوں استاد بزرگ شیخ شلتوت نے'' تنظیم دار التقریب کے وجود میں آنے میں ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے ان دنوں آپ الازہر یونیورسٹی کے استاد اور بزرگ عالم مانے جاتے تھے آپ مسلسل ہمارے

کارکنوں اورہم کاروں ہم فکرلوگوں کے ساتھ تقریب کی ترقی میں قدم بڑھاتے تھے، ایک جلسہ کے دوران آپ نے تجویز رکھی کہ اہل تسنن واہل تشیع کو جمع میں شریک ماننا چاہئے اورفرقہ یا طائفہ کے بجائے اسلامی مذاہب کے عنوان سے جاننا چاہئے۔ اور جب شیخ شلتوت الازہر یونیورسٹی کے رئیس بن گئے جب بھی آپ نے ''دارالتقریب'' میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ (بی آزارشیرازی، ۱۳۷۷ش، ص/۶۹)

علامہ شیخ محمد تقی قمی، شیخ شلتوت کے سابقہ تعاون اوردارالتقریب کے بارہ میں ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں: شیخ محمود شلتوت ۱۷، سترہ سال تک دارالتقریب کے ممبر رہے آپ اپنی عمر کے آخری پانچ سال الازہر کے رئیس بھی بنے پھر بھی آپ مسلسل شیعہ وسنی تقریب کے لئے انتھک کوششیں کرتے رہے۔ (روزنامہ جمہوری اسلامی، ۱۹/۱۰/۷۹، ویژہ نامہ ص/۹)

شیخ شلتوت دارالتقریب کا تاریخچہ مفصل طور پر تحریر کرتے ہیں جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے: مسلمانوں کو چاہئے کہ فخر کریں کہ عملی طور پر مذاہب کو ایک دوسرے سے قریب کرنے میں آگے آگے ہیں۔۔۔ میری تمنا تھی کہ تقریب کی داستان کو میرے دانشمند بھائی مصلح رہنما جناب شیخ محمد تقی قمی لکھتے تا کہ اس مجاہد دانشمند کی تقریب کی راہ میں فداکاریوں کے سلسلہ میں کچھ تمجید وتعریف ہوسکتی حالاں کہ وہ اس سلسلہ میں کچھ نہیں بولتے۔

وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس کی دعوت دی اوراسی تقریب کی خاطر انھوں نے ملک (مصر) کا سفر کیا اورتقریب کا بیج بونے میں کامیاب ہوگئے۔ ابتداء سے ہی تقریب کے ساتھ رہے اور بڑی مہارت، اخلاص ، بے پناہ علم ودانش، نمایاں شخصیت، راسخ عزم وارادہ، حوادث پر صبر وشکیبائی اور گردش ایام کے مقابل پائیداری واستقامت کے ساتھ تقریب کے پودے کو پرورش دیتے رہے، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس پودے کو تناور درخت اور شاخ وبرگ سے پر شجر کی شکل میں دیکھ لیا، جو پروردگار کے فضل وکرم ثمر بخش ہے اور جس کی گھنیری ڈالیوں کے زیر سایہ اس ملک (مصر) اور دیگر ممالک کے علماء ودانشمند اور مفکرین حضرات زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس موضوع کو ہم دوسرے انداز میں بیان کرتے ہوئے کہیں گے کہ: بھلا کون اس دعوت کے رموز اسرار اورحقائق ودقائق سے نیز اس کے پہلے بانی کے سلسلہ میں زیادہ معلومات رکھتا ہے۔

میں پہلے ہی روز سے تقریب مذاہب کی فکر میں ایک نصب العین کی حیثیت سے ایمان رکھتا تھا اوراس تنظیم کے ابتدائی وجود سے ہی اس کی سرگرمیوں اوراقدامات سے سروکار رکھتا تھا۔

الازہر کی زعامت وریاست کے دوران موقع غنیمت ہاتھ آیا کہ اسلام کے اصلی اور بنیادی مذاہب کی پیروی کے جواز کا فتویٰ صادر کروں کہ جس میں شیعہ دوازدہ امامی مذہب بھی شامل ہے اور یہ وہی فتویٰ ہے جو دارتقریب میں ہماری دسخط اور ہمارے اطلاع کے ساتھ نشر ہوا۔ وہی فتویٰ جس کی شہرت تمام اسلامی مما لک میں چھا گئی اور پاک و پاکیزہ اور باایمان افراد کی آنکھیں، جن کا مقصد حق ،تقریب مذاہب اورامت کی اطلاع کے علاوہ کچھ نہیں ہے روشن ہوگئیں۔ دوسری طرف اس کے بارے میں طرح طرح بحثیں اور سوالات ہونے لگے۔ میں تو فتویٰ کی حقانیت پر ایمان رکھتا تھا۔عزم محکم کے ساتھ جب بھی مجھ سے کوئی اس سلسلہ میں کوئی وضاحت چاہتا تھا میں اس کے پاس خط لکھتا تھا اور اس کی تائید کرتا تھا۔معترضین کے اعتراضات کا جواب بھی دے دیتا تھا اور جو مقالات اس سلسلہ میں نشر ہوتے ان کی اپنی تقریروں میں تائید کرتا تھا یہاں تک کہ خدا کی مدد وعنایت سے یہ فتویٰ مسلمانوں کے درمیان مسلم اصول اور ایک پا بر جا حقیقت کی شکل اختیار کر گیا۔لیکن کوتاہ فکر اور متعصب افراد حسب سابق فکری انحطاط سیاسی نزاع اور مذہبی اختلافات کا شکار رہے اور شبہات اور بے ہودہ تصورات القاء کرنے میں دلچسپی لیتے رہے۔

میری آرزو تھی کہ میں بہت سی ان شخصیات کے سلسلہ میں گفتگو کروں جنھوں نے اسلامی دعوت کو عام کرنے میں بڑی قربانی دی ہے۔ کافی لوگوں سے علمی مباحثہ، تبادلہ خیال کرتا رہا ہوں اور ان سے خط و کتابت کرتا رہوں ۔جن میں سرفہرست مرجع بزرگوار حاج آقا حسین بروجردی ۔ احسن اللہ فی الجنۃ مثواہ ۔ اور دوسری بزرگ شخصیات جناب شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء اور سید عبدالحسین شرف الدین موسوی رحمہما اللہ ہیں ۔شروع شروع میں عمومی فضا طرح طرح کی تہمتوں ، ملامتوں افترا پردازیوں اور فرقہ بندی کی وجہ سے ایک دوسرے کے نسبت برے خیالات سے پر تھی، لیکن مختلف اسلامی مذاہب (اہل سنت کے چار مذاہب اور دو شیعہ مذہب امامیہ اور زیدیہ) کے درمیان ''جماعت تقریب'' کی تشکیل بڑی آشکار کامیابی تھی کہ جس سے کینہ پرور اور متعصب افراد بھڑک اٹھے اور تقریب کی دعوت متعصب اور خشک افراد کے حملوں کا شکار ہوئی ۔ سنی سمجھتے تھے کہ دار التقریب انھیں شیعہ کرنا چاہتی ہے اور شیعہ سمجھتے تھے کہ ہم انھیں سنی بنانا چاہتے ہیں ۔ یہ لوگ درحقیقت دار التقریب کے مقصد کو درک نہیں کر سکے تھے یا درک نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ لہٰذا کہنے لگے: تقریب، مذاہب کو ملغٰی اور کالعدم کرنا چاہتی ہے یا سب کو ایک میں مدغم کرنا چاہتی ہے ۔ ہم خدا کے شکر گزار ہیں کہ فکر تقریب اسلامی اصلاحی افکار کی تاریخ میں تغیر و تبدیلی کا

اہم موثر قرار پائی اور بڑا گہرا اور وسیع اثر ڈالنے میں کامیاب رہی ہے۔ مسلمانوں کو فخر و مباہات کرنا چاہئے کہ عملی و فکری دونوں طریقہ سے اتحاد اور مذاہب کی تقریب میں ایک دوسرے پر سبقت لئے رہے ہیں اس کے مدیروں کے صحیح تفکر و اخلاص نیز دوسرے ہم عصر مسلمانوں کے اخلاص کے سایہ میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ہم خدائے بزرگ سے اس دعوت کی کامیابی و کامرانی کے جاری رہنے کی درخواست کرتے ہیں۔ بہت امید ہے کہ اسلام و مسلمین کی عظمت و شکوہ انھیں دوبارہ مل جائے اور اللہ کا ارشاد ان کے حق میں متحقق ہو جائے۔ خدا کا ارشاد ہے ''**کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تومنون بالله**'' ''تم بہترین امت تھے کہ انسانوں کی خاطر ظاہر ہوئے (کیوں کہ) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔'' **قل هذه سبيلی ادعوا الی الله علی بصرة انا و من اتبعنی** '' کہہ دو کہ یہی میری راہ ہے میں اور میرے پیرو کار بھر پور بصیرت کے ساتھ تمام لوگوں کو خدا کی جانب دعوت دیتے ہیں۔

''**یا ایها الذین آمنوا استجیبوا لله و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم**'' ''اے ایمان لانے والو خدا اور سول کی دعوت پر لبیک کہو جس وقت تمھیں وہ ان چیزوں کی طرف بلائیں جو تمھیں حیات عطا کرتی ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ (بی آ زار شیرازی، ۱۳۷۷ش، ص/۵۷)

شیعہ علماء سے روابط

۱۔ آیت اللہ بروجردی سے رابطہ

شیخ محمود شلتوت کے اتحاد بین المسلمین کی راہ میں اقدامات میں سے ایک دوسرے مذاہب خاص طور سے شیعہ مذہب کے علماء سے مسلسل رابطہ برقرار رکھنا ہے وہ شیعہ علماء خاص طور سے جناب آیت اللہ بروجردی سے بڑی الفت رکھتے تھے اور کئی مرتبہ ان کی عزت واحترام اور تکریم کی ہے۔ مثال کے طور پر جس وقت انھیں معلوم ہوا کہ محمد تقی قمی ایران سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو حضرت آیت اللہ بروجردی کے پاس خط لکھا اور جناب آقای قمی کے بدست روانہ کیا۔ آپ اس خط میں حضرت آیت اللہ بروجردی سے اظہار عقیدت کے ساتھ یہ مژدہ دیتے ہیں کہ حضرت آیت اللہ بروجردی کی طرف سے اسلامی مذاہب کے درمیان ارتباط کی خاطر کئے گئے اقدامات بڑے موثر اور کارساز ہیں۔ (بی آ زار شیرازی، ۱۳۷۷ش، ص/۳۱۶، مکتب اسلام، خرداد ۱۳۴۰ش، ص/۶۰)

۲۔ آیت اللہ کاشف الغطا کی امامت میں نماز جماعت

شیخ محمود شلتوت نے بیت المقدس میں منعقد ہونے والی فلسطین اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے دیگر علماء کے ساتھ سفر کیا اور وہاں آیت اللہ کاشف الغطا کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ آپ اس خوبصورت منظر کو جس میں شیعہ اور سنی سب ایک صف میں کھڑے تھے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: کتنا خوبصورت منظر ہے یہ کہ مسلمانوں کے نمائندے مسجد اقصی میں منعقد ہونے والی فلسطینی اسلامی کانفرنس میں جمع ہوئے اور سب نے ایک شیعہ امامیہ مجتہد استاد بافضیلت شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء کی اقتدا میں نماز پڑھی بغیر کسی فرق کے کہ کون اپنے کو سنی سمجھتا ہے اور کون شیعہ ہے۔ سب کے سب ایک صف میں ایک امام جماعت کے پیچھے ایک پروردگار کو پکار رہے تھے اور ایک قبلہ کی طرف کھڑے تھے۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۹ش، ص ۴۱)

تاریخی فتویٰ

شیخ شلتوت کی پوری زندگی میں ان کا اہم ترین اقدام دوسرے اسلامی مذاہب کی فقہ جیسے شیعہ امامیہ کی فقہ کی پیروی اور اس کے مطابق عمل کے جواز کا فتویٰ صادر کرنا ہے۔ شیخ شلتوت نے اپنے اس اقدام سے شیعہ سنی مذاہب کو ایک دوسرے سے قریب کرنے میں بہت اہم قدم اٹھایا ہے۔

فتویٰ کی سابقہ تاریخ

جس وقت الازہر یونیورسٹی کی ریاست و زعامت شیخ عبد المجید سلیم کے ہاتھ میں تھی انھوں نے چاہا کہ مذہب اہل بیتؑ کی پیروی کے جواز پر مبنی فتوی صادر کریں۔ وہ اس کام کو کر ڈالنا چاہتے تھے لیکن استکبار و سامراج کی طرف سے اہل سنت کی مقدس چیزوں کے سلسلہ میں ایک توہین آمیز کتاب منتشر ہو کر دار التقریب کے اراکین کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔

یہ کتاب ایک شیعہ عالم کی طرف منسوب تھی لیکن اس پر نہ تو تاریخ و محل نشر ثبت تھا اور نہ ہی کسی مطبع کا نام تھا جوں ہی یہ کتاب اعضاء تقریب کے ہاتھوں میں پہنچی شیعہ مذہب کے بارے میں غم و غصہ اور بدبینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس حادثہ کے پیچھے سامراجی عناصر کارفرما تھے عبد المجید سلیم جب اس سازش سے روبرو ہوئے تو بحرانی حالت اور شیعوں کے بارے میں وجود میں آئی نفرت کے پیش نظر فتویٰ صادر نہ کر سکے۔ اس لئے انھوں نے دوسرے موقع کا انتظار کرنا شروع کر دیا مگر موت نے مہلت نہ دی اور سالوں بعد ان کے

شاگرد شیخ محمود شلتوت نے یہ فتویٰ صادر فرمایا:

شاید مقدر میں یہی تھا کہ یہ فتویٰ شیخ محمود شلتوت کے ذریعہ صادر ہو اور ان کا نام اسلامی دنیا میں شہرت پا جائے۔ شیخ شلتوت کے فتویٰ کے تین عنصر تھے:

۱۔ کوئی بھی مسلمان مجبور نہیں ہے کہ چار میں سے کسی ایک سنی مذہب کی فقہ کا تابع ہو بلکہ ہر مسلمان کسی بھی مذہب کی فقہ کو اپنانے میں آزاد ہے۔

۲۔ ایک فقہی مذہب سے دوسرے فقہی مذہب کی طرف منتقل ہونا جائز ہے۔

۳۔ ہر مسلمان چاہے سنی ہی کیوں نہ ہو شیعہ امامیہ کی فقہ کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔ (نجف آبادی، ۱۳۶۴ش، ص۱۷۵)

فتویٰ کی عبارت

آخر کار ۱۷ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ بروز ولادت رئیس فقہ جعفری حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور روز ولادت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شیعہ امامیہ، زیدی، شافعی، حنبلی، مالکی اور حنفی علماء اور ان کے نمائندوں کی موجودگی میں شیخ محمود شلتوت نے مکتب تشیع کی پیروی کے جواز پر مبنی فتویٰ صادر کر دیا۔

فتویٰ کی عبارت اس طرح تھی:

> ''مذہب جعفری معروف بہ مذہب امامیہ اثنا عشری ایسا مذہب ہے جس کی پیروی مذاہب اہل سنت کے مانند شرعاً جائز ہے اس بنا پر مناسب ہے کہ مسلمین اس حقیقت کو درک کریں اور کسی معین مذہب کی نسبت ناحق اور ناروا تعصب سے دوری اختیار کریں کیوں کہ خدا کا دین اور اس کی شریعت کسی مذہب کے تابع نہیں ہے اور نہ ہی کسی خاص معین مذہب کے انحصار واحتکار میں ہے بلکہ تمام صاحبان نظر و مذہب مجتہد ہیں اور ان کا اجتہاد خدا کی بارگاہ میں مقبول ہے اور جو لوگ صاحب رائے ونظر نہیں ہیں وہ اپنے مورد نظر کسی بھی مذہب کی تقلید کرتے ہوئے اس کی فقہ کے احکام کی پیروی کر سکتے ہیں اور اس سلسلہ میں عبادات اور معاملات میں کوئی فرق نہیں ہے'' (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۷ش، ص۳۴۵)

شیخ محمود شلتوت

اس فتوی کے صادر ہوتے ہی دنیا اسلام میں سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی، اکثر مفکرین جو اس واقعہ کو شیعہ وسنی روابط کے حوالہ سے ایک اہم انقلاب تصور کرتے تھے انھوں نے اس فتویٰ کی حمایت کی۔ لیکن بعض کوتاہ فکر اور تفرقہ پھیلانے والوں نے اس اقدام پر شیخ شلتوت کو اعتراضات اور تنقیدات کا نشانہ بنایا کہ کیوں انھوں نے شیعہ مذہب کو سنی مذہب کیوں مان لیا ہے۔

صدور فتویٰ کے محرکات

اس فتویٰ کے صدور کے محرکات میں ایک اہم سبب شیعہ علماء کی فقہی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی دلیلوں میں غور وخوض اور تحقیق وتدبر ہے ، جسے شیخ شلتوت نے خود انجام دیا تھا شیخ شلتوت کا نظریہ تھا کہ شیعہ فقہ کے بعض احکام دلائل کے اعتبار سے اہل سنت کی فقہ پر برتری رکھتے ہیں، اس لئے بعض احکام خاص طور سے ازدواج، طلاق، برات وغیرہ خاندان سے متعلق احکام میں شیعہ فقہ کے مطابق فتویٰ دیا ہے آج بھی اس تاریخی فتویٰ کی ایک کاپی جو خود شیخ شلتوت کے ہاتھوں کی ہے آستانہ مقدس امام رضاؑ میں محفوظ ہے۔

شیخ شلتوت نے اس سلسلہ میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان اعتقادی روابط اور اتحاد کو متحقق کرنے کے لئے موثر اقدام کئے ہیں، جن میں سے ایک الازہر یونیورسٹی کے اندر فقہ مقارن کی تاسیس اور اس کے لئے دستور العمل کی تنظیم ہے۔ فقہ مقارن کے درس میں بہت سے موضوعات جیسے تین طلاق، طلاق معلق، مسئلہ رضاع، میراث ،طہارت وغیرہ کی تدریس ہوتی ہے۔

شیخ شلتوت آثار وتالیفات

شیخ محمود شلتوت اپنی پر برکت زندگی میں بیس سے زیادہ علمی مقالہ اور کتابیں علمی حلقوں کے سامنے پیش کر سکے اور اس طرح آپ نے جاوداں میراث یادگار کے طور چھوڑی تا کہ علم ومعرفت کے تشنہ افراد ان سے سیراب ہوسکیں، ان کی کتابیں ملاحظہ ہوں:

۱ . تفسیر القرآن الکریم : مجمع التقریب بین المذاهب الاسلامیه ، تهران ، ۱۳۷۹ش

یہ کتاب درحقیقت ''رسالۃ الاسلام'' نامی مجلّہ میں چھپنے والے سلسلہ وار مقالات کا مجموعہ ہے جو چودہ سال تک چھپتا رہا اور بعد میں اسے جمع کر کے کتابی شکل دے دی گئی ہے۔

۲ . مقارنة المذاهب فی الفقه

اس کتاب کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ہی واضح ہے اسلامی مذاہب کے درمیان قربت قائم کرنا ہے۔ شیخ شلتوت نے اس کتاب میں معاصر فقہ کے بارہ میں بحث کی ہے اور تمام مذاہب کے فقہی نظریات کو ذکر کر کے اسی مذہب کی رای ونظریہ کو قبول کیا ہے جو زمان ومکان سے ہم آہنگ اور قطعی دلائل و برہان پر استوار ہے۔ (اخبار تقریب، ش/۴۶، ۴۵، ص/۳۰)

۳ . من توجیهات الاسلام : مطبوعات الادارة العامة للثقافة الاسلامیة ۱۹۵۹ء

مولف نے اس کتاب میں بہت سے دینی مفاہیم کی وضاحت فرمائی ہے اور سماج کے اندر پائی جانے والی بعض مشکلات کے سلسلہ میں اسلام کا موقف واضح کیا ہے۔

اس کتاب کے بعض حصے ''مردم ودین''، ''اخلاق''، ''در کشتزار اجتماع''، ''اسلام ویاد بودہا'' جیسے عناوین کے تحت فارسی میں ترجمہ ہوکر نشر ہو چکے ہیں۔

۴۔ الفتاویٰ: ۱۸واں چاپ، دارالشروق، قاہرہ ۱۴۲۱ھ یہ کتاب شیخ شلتوت کی پوری حیات میں ان سے پوچھے گئے فقہی سوالات اوران کے جوابات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب عالم اسلام میں شیخ محمود شلتوت کی اہم ترین تالیف شمار ہوتی ہے جو مختلف اسلامی ممالک میں اہل سنت کے یہاں بڑی مقبول ہوئی۔

۵۔ من هدیٰ القرآن : دار الکتاب العربی للطباعة و النشر ، قاهره ۳۶۰ صفحہ

یہ کتاب پانچ فصلوں پر اور ''الی القرآن الکریم''، ''منہج القرآن فی بناء المجتمع''، ''القرآن والمراۃ''، ''الاسلام و العلاقات الدولیۃ''، ''فی السلم والحرب'' عناوین پر مشتمل تدوین ہوئی ہے۔

۶ . الاسلام عقیدة و شریعة : دارالقلم قاہرہ

یہ کتاب شیخ شلتوت کی اہم کتابوں میں سے ہے جس میں تین فصل ہے جن کے نام عقیدہ، شریعت، اور مصادر شریف ہیں۔

شیخ شلتوت نے پہلی فصل میں اسلام کے بنیادی اصولوں (توحید، نبوت، معاد، قضا وقدر) کی تشریح فرمائی ہے اور دوسری فصل میں عبادات خاندان کے سماجی احکام، میراث وغیرہ کی تشریح کی ہے اور آخر میں مصادر و منابع (قرآن شریف، سنت، رأے ونظر) کی بحث کی ہے۔

۷۔الیٰ القرآن الکریم: دار الہلال، قاہرہ اور تہران سازمان تبلیغات اسلامی، ۱۳۶۴ش ۱۸۴ صفحہ

شیخ شلتوت قرآن کا تین مقصد سمجھتے ہیں (شرک و بت پرستی سے دل کو پاک و پاکیزہ کرنے کے لئے عقائد کا جاننا، انسان کی عظمت و شان کو دو چند کرنے کے لئے اور نفس کو پاک و پاکیزہ اور مہذب بنانے کے لئے اخلاقیات، صحیح و سالم زندگی بسر کرنے کے لئے احکام کا جاننا) (الیٰ القرآن الکریم، مقدمہ ص/۶)

آپ اس کتاب میں قرآن پر اسی زاویہ سے نظر کرتے ہیں اور اس میں بحث کرتے ہیں اس کتاب کے بعض عناوین مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ یسألونک (مختلف موضوعات پر پوچھے گئے سوالات کے جوابات)

۲ . منهج القرآن فی بناء المجتمع

۳ . المسؤلیة المدنیة و الجنائیة فی الشریعة الاسلامیة

۴ . القرآن و القال

۵ . القرآن و المرأة

۶ . تنظیم العلاقات الدولیة فی الاسلام

۷ . الاسلام و الوجود الاولی للمسلمین

۸ . تنظیم النسل

۹ . رسالة الازهر

۱۰ . فقه القرآن و السنة

۱۱ . القتال فی الاسلام

شیخ شلتوت کی بعض کتابیں فارسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ جیسے، اسلام آئین زندگی اور سیری در قرآن۔

قاہرہ کا سورج ڈوب گیا

بالآخر اسلام کی یہ بڑی عظیم شخصیت ۲۷ رجب ۱۳۸۳ھ کو دیار باقی کی طرف کوچ کر گئی اور عالم اسلام کو سوگوار بنا گئی۔

تقریب بین مذاہب اسلامی کی راہ میں بڑے عظیم قدم اٹھانے والی اس شخصیت کی رحلت پر بڑی بڑی شخصیات نے پیغام تسلیت ارسال کئے۔جن میں الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ جیسی وزین کتاب کے مولف جناب آقای شیخ بزرگ تہرانی ہیں جنھوں نے علماء نجف کی نمائندگی کرتے ہوئے تقریب کے بزرگوں کے نام پیغام تسلیت ارسال کیا۔اسی طرح شیخ شلتوت اور آیت اللہ بروجردی کے آثار وافکار اور شخصیت کے اعزاز میں مجمع تقریب بین مذاہب اسلامی اور حوزہ علمیہ قم کی جانب سے تہران اور قم میں دوروز اعزازی کانفرنس ہوئی جس میں فریقین کے علماء نے تجدید عہد کیا اس کانفرنس میں مصر کے وفد کی قیادت وسرپرستی جناب شیخ محمود عبدالغنی عاشور فرما رہے تھے جو شیخ الازہر کے نائب تھے اس کے علاوہ مصر کی علمی شخصیت جو اس کانفرنس میں شریک ہوئی اور جس نے مقالہ بھی پیش کیا وہ جناب استاد ڈاکٹر نصر فرید محمد واصل ہیں جو مصر کے مفتی اعظم تھے۔جمہوری اسلامی ،۱۹/۱۰/ ۷۹ش ویژہ نامہ،ص/۹)

منابع و مآخذ:

۱۔آیت اللہ مکارم شیرازی ،ماہنامہ مکتب اسلام۔

۲۔احمدی ،مہدی ،محمد عبدہ:رایت اصلاح (طلایہ داران تقریب/۴)جمعیت تقریب مذاہب اسلامی،۱۳۸۳۔

۳۔ازغندی ،علی رضا،روابط خارجی ایران،۱۳۵۷۔۱۳۲۰،نشر توس،۱۳۷۶ش

۴۔الاسلام عقیدہ وشریعۃ ،دارالقلم قاہرہ۔

۵۔المنجد فی الاعلام ،لبنان ،چاپ ،۲۷،۱۹۸۲م

۶۔برآورد استراتژیک مصر،انتشارات موسسہ فرہنگی مطالعات وتحقیقات بین المللی ایران ،تہران ۱۳۸۱ش

۷۔بی آزار شیرازی ،کریم ،شیخ محمود شلتوت طلایہ دار تقریب ،مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی ،۱۳۷۹ش

۸۔خرم شاہی ،بہاءالدین ،دانشنامہ قرآن پژوہی ،انتشارات دوستان ،اول ،۱۳۷۷ق

۹۔خفاجی ،محمد عبدالمنعم ،الازہر فی الف عام ،بیروت مکتب الکلیات الحدیثۃ

۱۰۔روحانی (زیارتی)سید حمید ،بررسی وتحلیلی از نہضت امام خمینی ،مرکز اسناد انقلاب اسلامی ،تہران

۱۱۔شلتوت،محمود،درکشتزاراجتماع،سید خلیل،شرکت سہامی انتشار،۱۳۴۴ش،تہران۔
۱۲۔شریعتمداری،حسین،روزنامہ کیہان،۱۳۷۲ش۔
۱۳۔شلتوت،محمود،اخلاق،سید خلیل خلیلیان،شرکت سہامی انتشار،۱۳۴۴،تہران
۱۴۔شلتوت،محمود،اسلام ویادبوہا،سید خلیل خلیلیان،شرکت سہامی انتشار،تہران
۱۵۔شلتوت،محمود،مردم ودین،سید خلیل خلیلیان،انتشارات الہام،تہران
۱۶۔صالحی نجف آبادی،مجموعہ مقالات،نشر دانش اسلامی،۱۳۶۴ش
۱۷۔غروی،سید محمد،مع علماء النجف الاشرف،دارالثقلین،بیروت،اول ۱۴۲۰ق
۱۸۔ماہنامہ اخبار تقریب،مجمع تقریب مذاہب اسلامی
۱۹۔مجاہد،زکی محمد،الاعلام الشرقیہ،دارالغرب الاسلامی،بیروت،دوم،۱۹۹۴م
۲۰۔مہاجری،مسیح،روزنامہ جمہوری اسلامی،۱۳۷۹ش
۲۱۔نبوی،مرتضی،روزنامہ رسالت ۱۳۷۴ش
۲۲۔نہج البلاغہ،ترجمہ محمد دشتی،
۲۳۔ہمبستگی مذاہب اسلامی،ترجمہ ونگارش کریم بی آزار شیرازی،تہران،سازمان فرہنگ وارتباطات اسلامی، ۱۳۷۷ش

عالم اسلام کا تعارف

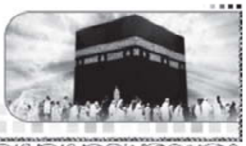

ترکی جمہوریہ کی جغرافیائی حدود

ع ۔ر۔امیردہی
ترجمہ سید ذاکر حسین جعفری

ا۔محل وقوع:

ترکی یورپ کے جنوب مشرق اور ایشیاء کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔اس کا شمالی عرض البلد ۳۶/۵ اور۴۲ ،اورمشرقی طول البلد ۲۶ و۴۵ کی ڈگری کے درمیان دنیا کے شمالی نصف حصہ میں واقع ہے۔ یہ ملک ایشیاء اور یورپ کے دو بڑے براعظموں کو آپس میں ملاتا ہے۔ترکی ،جس جغرافیائی علاقہ میں واقع ہے اس کو اناتولی اور ایشیائے صفید بھی کہتے ہیں۔ترکی مستطیل شکل کی ایک سرزمین ہے۔مشرق سے مغرب تک اس کی لمبائی ۱۶۶۰کلو میٹراورمتوسط طور پراس کی چوڑائی ۵۵۰کلومیٹر ہے۔

ترکی کے ہمسایہ مما لک میں چھ ایشیائی اور دو یورپی مما لک شامل ہیں۔مندرجہ ذیل مما لک سے ترکی کی سرحد میں ملتی ہیں: آذر بائیجان،۹کلومیٹر،آرمینیا ۲۶۸کلومیٹر،ایران ۴۹۹کلومیٹر، بلغاریہ،۲۴۰کلومیٹر، جارجیا ۲۵۲ کلومیٹر،عراق ۳۶۵کلومیٹر،شام ۸۲۲کلومیٹراور یونان ۲۰۶کلومیٹر۔

۲)۔ترکی کا رقبہ:

ترکی کا رقبہ ۷،۸۰،۵۸۰مربع کلومیٹر ہے جس میں ۷،۶۰،۷۷،۰مربع کلومیٹر خشکی اور ۹،۸۲۰مربع کلو میٹر آبی ہے۔ترکی کے تین طرف دریائی راستہ ہے وسعت کے لحاظ سے ترکی کا رقبہ ۷۸۰۵۸۰مربع کلومیٹر پر مستمل

ہے (جو ایران کے آدھے رقبہ سے کچھ کم ہے) رقبہ کے لحاظ سے ترکی دنیا کا پینتیسواں (۳۵) ملک ہے۔

۳)۔ سیاسی اور سوق الجیشی حیثیت:

چوں کہ ترکی کا کچھ حصہ یورپ اور کچھ حصہ ایشیا میں واقع ہے، اس لئے ترکی جیو پولیٹیک کے لحاظ سے کافی اہمیت کا حامل ہے اور گزشتہ صدی کے اواخر میں سابق سوویت یونین کے انحلال کے بعد اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ترکی کے تین طرف آبی راستہ ہے۔ شمال میں بحر اسود، جنوب میں مدیترانہ نامی سمندر اور مغرب میں اذہ نامی سمندر، شمال مغرب میں مرمرہ نامی اہم داخلی سمندر ہے جو شمال میں اہم اور اسٹریٹیجک گزرگاہ بسفر سے بحرہ اسود اور اہم گزرگاہ ڈارڈنل کے ذریعہ بحر اژہ سے متصل ہوتا ہے۔

ترکی اگر چہ تقسیم بندی کے لحاظ سے ۸۱ صوبوں پر مشتمل ہے لیکن جغرافیائی لحاظ سے مندرجہ ذیل سات علاقوں میں تقسیم ہوتا ہے: شمال میں آناتولی کا علاقہ (بحر اسود کا علاقہ)، مرمرہ کا علاقہ جو دریائے مرمرہ اور ترکی کے یورپی حصہ پر محیط ہے، اژہ کا علاقہ، مدیترانہ کا علاقہ (جنوبی ترکی) مرکزی اناتولی کا علاقہ، مشرقی اناتولی کا علاقہ، جنوب مشرقی اناتولی کا علاقہ، (فلاح زادہ ۱۳۸۴، ص ۲۳)

۴)۔ آبادی و زبان:

ترکی کی آبادی اس وقت جوان اور پر تلاش ہے۔ اس کی وجہ ۱۹۲۳ء میں اس ملک کی آزادی کے بعد حکومت کی پالیسی ہے جس نے آبادی کے اضافہ کی طرف قدم اٹھایا۔ ۲۰۰۵ء کے مردم شماری کے مطابق ترکی کی آبادی ۶ کروڑ ۹۶ لاکھ ۶۰ ہزار اور ۵۵۹، افراد تک پہنچ گئی ہے۔ (دانش نامہ آزاد) (وکی پیڈیا (http://fa.wikipcdia.org

اس ملک میں آبادی کے رشد کی سطح جنوبی اناتولی علاقہ میں ملک کے سمال اور مغربی حصوں کی نسبت کم ہے۔ اناتولی کے جنوب مشرقی حصہ میں بالخصوص جن علاقوں میں بارش کافی برستی ہے جیسے ٹوروس (Toros) کے پہاڑی علاقہ کے نشیبی حصے اور سیرت و مارڈین کے کوہستانی علاقہ میں آبادی کا رشد کافی زیادہ ہے اور جنوب کی طرف جتنا دور علاقہ ہوتا جائے گا خشک سالی کی وجہ سے آبادی بھی کم ہوتی چلی جائے گی۔

ترکی کے اکثر لوگ ترک ۷۰ فیصد اور کرد ۲۵ فیصد دو قوموں پر مشتمل ہیں ۔ترکی کے کرد عوام ملک کے مشرق اور جنوب مشرقی علاقہ میں زندگی بسر کرتے ہیں اس ملک کی سرکاری زبان ترکی ہے ۔ترکی میں بسنے والے دوسرے چھوٹے گروہ یہ ہیں: آذری (مشرقی شمال)، لاز (شمال) عرب (جنوب) اور آرمینیائی (استنبول میں) رہائش پذیر ہیں۔

ترکی کے دوسرے شہروں کی نسبت استنبول کو جغرافیائی، تجارتی اور اقتصادی سرگرمیوں، اور تاریخی وسیاحتی لحاظ سے کافی اہمیت حاصل ہے۔اس شہر کی آبادی بھی دوسرے شہروں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

۵)۔اقتصادی نظام

ترکی وہ ملک ہے جس کا اقتصادی نظام سرمایہ داری اور آزاد اقتصادی بازار سے وابستہ ہے اور خصوصی شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی ۔۱۹۹۹ء میں ترکی اقتصادی ترقی کے حامل ۲۰ ممالک میں شامل ہوا جو G۲۰ کے نام سے معروف ہیں ۔ترکی نے ۱۹۹۶ء میں یورپی یونین کے کسٹم اتحاد میں شمولیت اختیار کی اور دسمبر ۱۹۹۹ء ہلسینکی میں یورپی یونین کے سربراہی اجلاس میں یورپی یونین کی رکنیت حاصل کرنے کے سرکاری نامزدگی حیثیت سے ترکی کی درخواست قبول کی گئی اس کے بعد سے ترکی نے یورپی یونین کے اقتصادی قوانین ومعیار کے ساتھ ہم آہنگی کرنے کے لئے اہم قدم اٹھائے ہیں۔

(http://fwww.turkishembassy.org/governmentpolitics/index.htm)

اس کے علاوہ امریکہ نے بھی اس ملک میں اہم اقتصادی پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ بھی کیا ہے جن میں باکو، جیجان پائپ لائن اور ترکی میں صنعتی علاقوں کے قیام کا نام لیا جاسکتا ہے۔

۶)۔آبادی اور اقتصادی رجحانات

۱۹۵۰ء کے عشرے سے قبل ترکی کے اکثر لوگ زراعت کی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔اس کے بعد جب زراعت کے شعبہ میں جدید ٹیکنالوجی کا اضافہ ہوا اور صنعت کے شعبہ میں فروغ ہوا، تو ترکی کے لوگوں کا رجحان صنعتی شعبہ کی طرف بڑھا اور ۱۹۹۰ء کے عشرے میں ترکی میں ۴۰ فیصد لوگ زراعت کے شعبہ میں مشغول تھے

جب کہ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ۶۶ فیصد لوگ زراعت کے شعبہ میں کام کاج میں مشغول تھے۔ آج اقتصادی شعبہ میں مشغول اکثر لوگ زراعتی شعبہ میں بھی سرگرم عمل ہیں، لہٰذا خدمات رسانی، سیاحت اور صفت کے شعبہ آج بھی دوسرے درجہ پر واقع ہیں۔ (قاسمی ۱۳۷۴ص ۱۱۱)

۷)۔ترکی کا پرچم

ماڈرن ترکی کے پرچم کا نقشہ یوں ہے کہ سرخ رنگ کے کپڑے پر سفید رنگ کا چانداور ستارہ نقش ہے جس سے ترکی کے سلجوقی اور عثمانی بادشاہ استفادہ کیا کرتے تھے۔ چاند وستارہ ترکی کے قبائل کی اصلی علامت تھی دسویں صدی عیسوی سے ایشیا ءصغیر (آناتولی) مرکزی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے بڑے حصہ پر خوارزمی، سلجوقی او رغزنوی بادشاہوں کا کنٹرول رہاہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں عثمانی سلاطین نے بھی اس پرچم کو حکومت کے نشان کے طور پر محفوظ رکھا اور چوں کہ عثمانی بادشاہ مسلمانوں کے خلیفہ کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے یہ پرچم اسلامی علامت کا مظہر قرار پایا۔

آج کل بہت سے اسلامی ممالک کے پرچموں میں چاند ستارہ موجود ہے۔ ہلال احمر کا نشان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا، عالمی ریڈ کراس ۱۸۶۲ء میں ہنری ڈونٹ نے تشکیل دیا جو سویز رلینڈ کا ایک تاجر تھا چوں کہ اس کا نشان سویز رلینڈ کی حکومت اور حضرت عیسیٰؑ کی دیانت کا نشان ہے اس کے مدمقابل اسلامی نشان ہلال احمر کی شکل میں پہلی عالمی جنگ کے بعد معرض وجود میں آ گیا۔

جن ممالک کے پرچموں پر چاند ستارہ کا نشان ہے ان میں آذربائیجان، ازبکستان، الجزائر، پاکستان، ترکی، ترکمنستان، تیونس، سنگاپور، ملائشیا، مورتیانیہ شامل ہیں۔ (وکی پیڈیا، سائٹ (دانشنامہ آزاد ،http://fa.wikipcdia.org)

سیاسی حالات

ا:۔تاریخی سابقہ

موجودہ ترکی درحقیقت چھ سوسالہ عثمانی بادشاہت کی یادگار ہے ۱۹۲۳ء میں عثمانی سلطنت کے زوال اور

اتحادیوں کے ساتھ صلح کے سخت شرائط کے سامنے عثمانی بادشاہ کے ہتھیار ڈالنے کے بعد پہلی عالمی جنگ میں دار ڈینل دفاعی فوج کے کمانڈر مصطفیٰ کمال پاشا جس نے عثمانی بادشاہ اور مرکزی حکومت کے خلاف انقرہ میں بغاوت کر کے ترکی کی موجودہ داغ بیل ڈالی، جو بعد میں آتاترک یعنی بابائے ترک کے نام سے مشہور ہو گیا۔

(http://fwww.turkishembassy.org/governmentpolitics/index.htm)

عثمانی سلطنت جو خود ۱۲۹۹ء میں سلجوقی سلطنت کی جانشین بن گئی تھی اپنی حکومت اور قدرت کے دور میں موجودہ بالکان کے بڑے حصہ، مصر، عراق، سعودی عرب، الجزائر، شام اور مجارستان پر کنٹرول قائم تھا، لیکن ۱۵۶۶ء میں عثمانی سلطنت کے آٹھویں اور قدرتمندترین بادشاہ سلیمان قانونی کی موت کے بعد عثمان سلطنت میں داخلی بحران اور کمزوری پیدا ہوگئی اور اس کے بعد عثمانی سلطنت اپنی حیات کے آخری دن تک دفاعی پوزیشن میں رہی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایک طرف عثمانی سلطنت کی طرف سے جرمنیوں کی حمایت اور دوسری طرف عثمانی حکومت کے اندر آزادی طلب تحریکوں کے ظہور اور ۱۹۱۸ء میں عثمانی سلطنت نے دشمنی ترک کی اور صلح کی قراردادوں پر دستخط کر کے سعودی عرب، شام، عراق اور افریقہ کی بہت سی سرزمینوں کو اتحادیوں کے حوالے کر دیا، اور آخر کار نومبر ۱۹۲۲ء (۱۳۴۲ھ) میں قومی کونسل نے عثمانی بادشاہ کو برطرف کر کے عثمانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

آتاترک نے ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۲۳ء تک ترکی میں گڑبڑ پیدا کر کے ترکی کے سیاسی وسماجی میدان میں قدم رکھا اور پہلی عالمی جنگ میں وہ عمدہ صلاحیتوں پیش نظر ہر دلعزیز بن گیا تھا وہ لوزان عہد نامہ کے ذریعہ موجودہ ترکی کی سرحدیں مشخص ہونے کے بعد ترکی کے پہلے صدر کے عنوان سے منتخب ہو گیا۔

آتاترک نے ترکی کے جدید ملک میں ثقافتی وسماجی تبدیلیاں منجملہ سیاست میں مذہب کی عدم مداخلت، بے حجابی و بے پردگی کی ترویج، اسلامی حجاب کی ممنوعیت، ترکی کے عربی رسم خط کی جگہ لاتینی رسم الخط کا استعمال، اسلامی کلینڈر کی جگہ عیسوی کلینڈر، خلاصہ مغربی تمدن کی ترویج اس کے اہم اقدامات میں شامل ہیں۔

ترکی کے دوسرے صدر عصمت اینونوے بھی آتاترک کے راستے پر گامزن رہا، یہاں تک کہ دوسری عالمگیر جنگ کے وقوع کے ساتھ مغرب نواز ترکی کی اندرونی اور بیرونی پالیسی میں تبدیلیاں وجود میں آئیں جس میں

چند حزبی نظام اور مغرب نواز رجحان شامل ہے۔ جلال بایار کی رہبری میں جنوری ۱۹۴۶ء میں ڈیموکریٹ پاٹی اس ملک میں تشکیل پائی۔ اس نے ۱۹۵۰ کے عام انتخابات میں اکثریت حاصل کر کے ۱۹۶۰ء تک زمام حکومت سنبھال لی اور آخری سال میں فوجی بغاوت کے ذریعہ اس کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک اتحادی حکومتوں کے ذریعہ ملک کا نظام چلتا رہا۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں سلیمان ڈمیرل کی قیادت میں حزب عدالت انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن ملک میں اقتصادی مشکلات اور سماجی شورشوں کی بناء پر ترکی میں ۱۹۷۰ء میں دوسری فوجی بغاوت رونما ہوئی اور ترکی میں فوج نے دو سال تک حکومت کی، اس کے بعد قومی پارلیمنٹ نے فخری کوروترک کو ترکی کا چھٹا صدر منتخب کیا۔

ستر کے عشرے میں کوئی اکثریتی حکومت تشکیل نہ پاسکی اور ملک کا نظام ہمیشہ مخلوط حکومت کے ذریعہ چلتا رہا۔ سن ستر کے عشرے کے اواخر میں فوج کی طرف سے ملک کے امور میں مداخلت اور عوام کی عام بیزاری نے ترکی کو داخلی سطح پر فلج کر دیا، یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۸۰ء میں جنرل کنعان اورن کی قیادت میں ترکی میں ایک اور فوجی بغاوت رونما ہوئی اور جنرل کنعان اورن نے سن اسی کے عشرے کے اواخر تک سیاسی طاقت کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اورن نے چھ افراد پر مشتمل قومی سلامتی کونسل تشکیل دی اور بہت سی پارٹیوں کی سرگرمیوں کو ممنوع یا محدود کر دیا اور ترکی کے بنیادی آئین جس میں سن ستر کے اوائل میں تبدیلی لائی گئی تھی اس میں پھر سے تبدیلی ایجاد کی۔

ترکی میں سیاسی بحران سن ۸۰ اور ۹۰ کے عشروں میں نسبتاً کم سطح پر جاری رہا، یہاں تک کہ سن ۱۹۹۶ء میں نجم الدین اربکان کی قیادت میں رفاہ پارٹی نے حکومت سنبھالی، لیکن فوج کی مداخلت سے اس کی حکومت ختم ہوگئی اور پانچ سال تک اربکان کو سیاسی سرگرمیوں سے محروم کرنے کے بعد ترکی میں سیاسی کشمکش میں مزید اضافہ ہوگیا۔ (فلاح زادہ، پیشین، ص/۳۹۔۳۷)

۲:۔ سیاسی ڈھانچہ

ترکی کے آئین میں ۱۹۷۱ء ، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۴ء کے سالوں میں اندرونی تحولات کی بناء پر تبدیلیاں وجود میں آئیں بالآخر ۱۹۸۲ء میں اس ملک کے نئے آئین پر عوامی ریفرینڈم کرایا گیا اور ۹۰ فی صد عوام نے اس کے

حق میں رائے دی،۱۹۸۲ء کے آئین کی شق نمبر ا کے مطابق ترکی کی حکومت جمہوری ہوگی۔شق نمبر۲ میں جمہوریت کی تشریح اس طرح ہے کہ حکومت ڈیموکریٹک، غیر مذہبی، سماجی نظام پر مبنی قانون کی حمایت پر مشتمل، اور عام صلح، انسجام، قومی انصاف، انسانی حقوق کا احترام اور آتاترک کے نیشنلزم کے ساتھ وفاداری کی پابند ہوگی۔

ترکی میں مجریہ، عدلیہ اور مقنّنہ پر مشتمل تین قوتیں ہیں جو قانون کے مطابق ایک دوسرے مستقل عمل کر لی ہیں۔اس ملک کی حکومت پارلیمانی اور صوبائی قسم کی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ صدر جو پارلیمنٹ کی طرف سے سات سالہ مدت کے لئے منتخب ہوتا ہے وہ وزیر اعظم کو معزول کر سکتا ہے اور پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر سکتا ہے یا فرمان صادر کر کے قانون وضع کر سکتا ہے صدر عام حالت میں پارلیمنٹ کے منظور شدہ قوانین کو ویٹو کر سکتا ہے اور پارلیمنٹ مذکورہ قانون میں ردوبدل کر کے یا توضیحات دے کر دوبارہ صدر کو پیش کر سکتی ہے اور دوسری مرتبہ صدر کو ویٹو کا حق نہیں ہے۔قابل ذکر ہے کہ صدر بحرانی حالات میں پارلیمنٹ کو توڑ سکتا ہے اور نئے انتخابات کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

اسی طرح ملک کے آئین میں ایک حکومتی مشاورتی کونسل کو مدنظر رکھا گیا ہے جو صدر کو وظائف انجام دینے میں مدد فراہم کرتی ہے۔اس کونسل کے اراکین سابق صدور اور آئین کی عدالت کے ریٹائرڈ جج اور فوج کے سابق سربراہان ہیں ان اراکین میں سے بیس کو چھ سال کی مدت کے لئے خود صدر منتخب کرتا ہے اور دوسرے دس اراکین کو خود کونسل کے اراکین انتخاب کرتے ہیں۔(قاسمی، پیشین)

۳:۔سیاسی احزاب اور گروہوں کی صورتحال

۱۹۲۳ء میں آزادی کے بعد ترکی میں سب سے پہلے ریپبلکن پارٹی (CHP) کی داغ بیل آتاترک نے ڈالی اور ۲۳ سال تک کسی رقیب پارٹی کے کے بغیر ملک کا نظم و نسق ہاتھ میں رکھا۔ ۱۹۴۰ء کے عشرہ کے اواخر میں ڈیموکریٹ پارٹی وجود میں آئی جس کے اراکین ریپبلکن پارٹی سے الگ ہوئے تھے ڈیموکریٹک پارٹی نے ترکی میں سیاسی احزاب کے تحولات میں سنگ میل کا کردار ادا کیا اور ۱۹۵۰ء کے عشرے کے اواخر تک ترکی کا نظام ان دو پارٹیوں کے ذریعہ چلتا رہا لیکن ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اوائل میں ترکی کے داخلی سیاسی میدان میں فوج کی

مداخلت اور ڈیموکریٹ پارٹی کی فعالیت پر پابندی عائد ہونے کی وجہ سے متعدد اور اتحادی پارٹیوں کے برسر اقتدار آنے اور سیاسی احزاب کی کمزوری کا موجب بن گیا۔ترکی میں سیاسی جماعتوں کی فعالیت وسرگرمی نئے مرحلے میں داخل ہونے والی تھی کہ سیاست میں فوج کی دوبارہ مداخلت اور ۱۹۷۰ء میں سیاسی افراد کے ہاتھ سے قدرت خارج کرنے کی وجہ سے ملک کو ڈیموکریسی اور جمہوری راستے پر گامزن ہونے میں خلل ایجاد ہوگیا اور حکومت سے فوج کی کنارہ کشی اور اقتدار کو سیاسی افراد کی تحول میں دینے کے باوجود ۱۹۷۰ء کے پورے عشرے میں افراتفری کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ترکی میں قتل وغارت گری اور ہرج ومرج میں اضافہ ہوگیا اور پارلیمنٹ میں صدر کے انتخاب پر احزاب میں عدم تفاہم کی وجہ سے ۱۹۸۰ء کے عشرے کے اوائل میں پھر سے فوج سیاست میں واپس آگئی اور ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو منحل کیا گیا اور اہم سیاسی شخصیات کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

سیاسی احزاب کی کمزوری اور متعدد ومخلوط جماعتوں کی حکومت تشکیل پانے کے نتیجہ میں سیاسی میدان میں فوج کی مداخلت کا سلسلہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشرے میں جاری رہا لیکن سن ۱۹۸۳ء سے بعض سابقہ جماعتوں نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا دوبارہ آغاز کر دیا۔

ترکی میں اب متعدد پارٹیاں موجود ہیں لیکن پارلیمنٹ میں صرف چند سیاسی جماعتوں کے نمائندے ہیں ۔ترکی کے بعض سیاستدانوں کا خیال ہے کہ ترکی میں متعدد احزاب کا وجود اس ملک میں جمہوریت کی علامت ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چھوٹی پارٹیاں صرف شخصی مفادات اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ مقابلہ کی غرض سے تشکیل پائی ہیں بعض افراد سیاسی جماعتوں میں اضافہ کا اصلی سبب احزاب کے اندر ڈیموکریسی کا فقدان اور افراد کو اپنے عقائد وافکار کے آزادانہ طور پر بیان کرنے کی اجازت نہ دینے کو قرار دیتے ہیں جس کے نتیجے میں لوگ بڑی جماعتوں سے الگ ہو کر چھوٹی جماعتیں تشکیل دیتے ہیں اور ہر پارٹی کے لئے پارلیمنٹ میں پہنچنے کے لئے ملک کی تمام اراء میں سے دس فیصد آراء کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

سرکاری اعداد کے مطابق ترکی میں اس وقت ۳۵ سے زائد سیاسی پارٹیاں سرگرم عمل ہیں سیاسی تقسیم کے حوالے سے بعض پارٹیاں حسب ذیل ہیں۔

دائیں بازو کی پارٹیاں:

۱۔حزب اعتدال،حزب راست اور مام میہن

۲۔راست تندرو پارٹی،قومی تحریک وجوان پارٹی

۳۔حزب عدالت وتوسعہ اورحزب سعادت

بائیں بازو کی پارٹیاں:

۱۔مغرب نواز پارٹی،ڈیموکریٹ پارٹی

۲۔مشرق نواز پارٹی،عوامی ڈیموکریٹ پارٹی (دھاپ)

ترکی کے دوسرے سیاسی گروہوں اور پارٹیوں میں کردستان عوامی کانگریس اورفضیلت پارٹی (رفاہ)، ترکی ڈیموکریٹک پارٹی، لیبر پارٹی، بزرگ عدالت پارٹی، ترک انقلابی پارٹی، حزب تولدنویں حزب ہمبستگی وآزادی اورصلح ڈیموکریسی پارٹیوں کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔لیکن ۱۹۸۲ء کے بنیادی آئین کے مطابق تمام انجمنوں، یونینوں، لیبراورتجارتی ادروں کی سیاسی موضوعات ومعاملات میں سرگرمی وفعالیت پر پابندی عائد کی گئی ہے۔

۴۔ترکی میں آخری سیاسی تبدیلیاں

ترکی کے سیاسی میدان میں حالیہ سالوں کے دوران واضح تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔۱۹۹۰ء کی دہائی اور اس کے بعد وجود میں آنے والی اسلام نواز کی اجمالی صورت حال کچھ یوں ہے:

اربکان کی رہبری میں ۱۹۹۴ء میں جب رفاہ پارٹی نے بلدیاتی انتخابات میں فتح حاصل کی تو اردوغان استنبول کے میئر منتخب ہوئے۔اس کے بعد فوج نے بڑے آرام کے ساتھ ایک بغاوت کے ذریعہ ۱۹۹۸ء میں اربکان کو وزارت عظمی کے عہدے سے ہٹادیا اورعدالت کے ذریعہ اس کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی گئی ۔ترکی کی پارلیمنٹ میں رفاہ پارٹی کے حامیوں نے فضیلت نام سے ایک نئی پارتی تشکیل دی اوراس پارٹی نے بھی سن ۱۹۹۹ء کے انتخابات میں ۱۵فیصد آرا لے کر سیاسی میدان میں قدم رکھا اوراسی وجہ سے فوج اورسیکولرتنظیموں نے خطرمحسوس کیا اور ۲۰۰۱ء میں عدالت کے ذریعہ اس کی سیاسی سرگرمیوں پر بھی پابند عائد کردی اس بات پر اردوغان

نے فوجیوں اور مخالفین پر شدید تنقید کی جو اس وقت استنبول میں میئر کے عہدے پر تھے، جس کی بنا پر اسے اکسانے اور تحریک کرنے کے الزام میں جیل جانا پڑا۔

فضیلت پارٹی کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگانے کے بعد اسلام کے حامی دو پارٹیوں کی شکل میں ظاہر ہوئے اور رجائی کونان کی قیادت میں ایک گروہ نے سعادت پارٹی کو تشکیل دیا اور دورے گروہ نے اردوغان وعبد اللہ گل کی قیادت میں عدالت وتوسعہ پارٹی کی داغ بیل ڈالی اس پارٹی نے ترکی کی پارلیمنٹ کے آخری انتخابات میں سب سے زیادہ آرا حاصل کیں اور اب تک ترکی حکومت کی باگ ڈور اور زمام امور کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ عدالت وتوسعہ پارٹی کی ترکی میں حکومت کا آغاز اور عراق پر امریکہ کے حملہ کا آغاز بیک وقت ہوا، اور امریکہ کے ساتھ جنگ میں عدم تعاون کی بنیاد پر عوام میں اس پارٹی کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ پارٹی امریکہ کے ساتھ عمیق روابط برقرار کرنے کی خواہاں ہے اور اس کے رہنماؤں نے فلسطین میں اسرائیل کے جرائم کے خلاف سخت موقف اختیار کر رکھا ہے اور اسرائیل کے ظالمانہ اقدامات کی مذمت کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ پارٹی یورپی یونین کی رکنیت حاصل کرنے کی شرائط فراہم کرنے میں بھی کوشاں ہے۔ (قاسمی، پیشین، ص ۵۰)

سماجی صورت حال

ا:۔ آداب ورسوم

ترکی کا آج کا سماج جو ایک طرح سے کل کے معروف سلطنت کا وارث ہے وہ آداب ورسوم وثقافت کے لحاظ سے بہت غنی ہے۔ اس معاشرے میں بڑے شہروں کے باشندوں اور دیہاتیوں کے درمیان بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے اور درحقیقت تجدد پسندی اور سنت گرائی ایک دوسرے کے مد مقابل ایک خاص علامت بن گئے ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ عثمانی سلطنت کے زوال اور آتاترک کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ترکی کے آداب ورسوم میں تبدیلی کا آغاز ہوا ہے۔

ترکی کے معاشرے کی ثقافتی خصوصیات میں چھوٹے کی طرف سے بڑے کا کافی احترام پایا جاتا ہے، جیسے بڑوں کے ہاتھ کا بوسہ لینا، ترکیوں کے سماجی آداب ورسوم میں اس امر کی حرمت واضح نظر آتی ہے۔

ترکی کے شہروں میں کوئی ایسا محلّہ نہیں پایا جاتا ہے جس میں قہوہ خانہ موجود نہ ہو قہوہ خانہ مختلف اور عام افراد سے لے کر طلبا اور سیاسی پارٹیوں کے طرفداروں کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ ترکی کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں قوہ خانہ کا ایک اہم مقام ہے جس کا تاریخی سابقہ عثمانی سلطنت سے جاملتا ہے۔ (ابوالقاسمی اور اردوش حسین ۱۲۷۸ ص/۲۴۸)

ترکی کے لوگ اپنی ظاہری صفائی اور نظافت پر خاص توجہ رکھتے ہیں اور وہ اپنی ظاہری صفائی پر دسترخوان کو رنگین رکھنے سے ترجیح دیتے ہیں۔

ترکی کے لوگوں کے بعض خاص آداب و رسوم مندرجہ ذیل ہیں:

- لڑکے کو ترجیح دینا یا اس کی طرف رجحان رکھنا۔
- لڑکوں کا ختنہ کرنے میں اہتمام۔
- اپنے فرزندوں کو فوجی ٹریننگ پر بھیجنے کے سلسلہ میں پرشکوہ تقریبات کا اہتمام۔
- شادی بیاہ میں شاندار تقریب کا انعقاد۔
- لڑکی کو نامزد کے ذریعہ فرار پر مجبور کرنا جس کے ماں باپ شادی کے لئے رضامند نہ ہوں۔[۱]
- قبیلہ اور انفرادی شکل میں موروثی قتل کا انتقام لینا۔
- شادی کی تقریب میں مبلغ جمع کرنا اور دولہا اور دلہن کے لئے مشترکہ طور پر جہیز فراہم کرنا۔
- متوفی شخص کے لئے عزاداری برپا کرنا۔
- محل ولادت کے ساتھ خاص حساسیت اور محبت رکھنا۔
- اندرونی قومی گروہی سماجی روابط۔
- نوروزکی تقریب منعقد کرنا بالخصوص شیعہ اور کروں کا اس پر اہتمام۔

۱۔ یہ رسم دیہاتوں میں رائج ہے

- بڑوں کا احترام، بچوں اور عورتوں اور ناداروں کی مدد۔
- کھیل کود، ثقافتی، ہنری، اور سنتی پروگراموں کا اہتمام۔
- مقامی اور سنتی غذاؤں کے ساتھ دلچسپی۔ (حکیم پور و مرجانی، ۱۳۷۳، ص/۳۵)

۲۔خاندانی پابندیاں

یہ بات مسلم ہے کہ مغربی تہذیب کے ورود سے ترک خاندان بھی بے نصیب نہیں رہے ہیں لیکن سنتی نظام کے دوام و استقامت کی بنا پر مغربی تہذیب کو موثر ہونے میں کافی دشواری کا سامنا ہے اور ان خصوصیات کی آہٹ کو ترکی کے معاشرے میں خاندان اور شادی کے متفاوت ہونے کی شکلوں میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

خاندان سنتی اور وسیع شکل میں سے چھوٹی چھوٹی شکلوں میں تبدیل ہو رہے ہیں لیکن یہ معاملہ ترکی کے تمام علاقوں پر صادق نہیں آتا ہے لہذا یونیسف کی طرف سے انجام پانے والے جائزوں کی روشنی میں ترکی کے مشرق اور شمال میں ساکن ہر ۱۰۰ خاندان میں سے ۴۸ اور ۴۰ خاندان سنتی اور وسیع نوع کے ہیں جب کہ مغربی علاقوں میں ۷۳ فیصد لوگ چھوٹے خاندان پر مشتمل ہیں۔ (قاسمی، پیشین، ص/۳۹)

دیہاتی علاقوں میں لوگ اپنے بچوں کے لئے مناسب رشتہ کا انتخاب کرنے میں کافی سرگرم رہتے ہیں لیکن شہری علاقوں میں طرفین کے انتخاب اور درخواست پر شادی ہو جاتی ہے۔ ترکی میں ۱۸ سال سے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی قانون کے خلاف ہے۔ مردوں کے لئے متوسط عمر ۲۵ سال اور عورتوں کے لئے ۲۲ سال ہے۔ سنتی بالخصوص دیہاتی خاندانوں میں شادی کی تمام تشریفات کو انجام دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور دیہاتوں میں لڑکیوں کو فرار پر مجبور کرنے کا ایک عامل ان متعدد تشریفات کے سنگین بوجھ سے نجات حاصل کرنا بھی ہے۔ لڑکی کو خواستگار کے ساتھ فرار پر مجبور کرنے کی رسم کو ''کنیز کا چیر ماک'' کہتے ہیں۔[۱]

ترکی میں شادی کی دوسری خصوصیات میں قریبی رشتہ داروں کی آپس میں شادیاں ہے۔ قریبی رشتہ

۱۔لڑکی کا خواستگار کے ہمراہ فرار اور پھر عدالت میں ان کا شرعی طور پر یا قانونی شکل میں شادی کرنا ہے۔

داروں کے ساتھ شادی کرنے کے سلسلہ میں ذرائع ابلاغ کی طرف سے اس کے برے اثرات پر تنبیہ کرنے کے باوجود ۱۵/ شادیاں رشتہ داروں اور ۷ فیصد شادیاں قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ترکی کے مشرق میں ۲۳ فیصد اور جنوب اور شمال میں ۲۰ فیصد شادیاں رشتہ داروں کے ساتھ ہوتی ہیں۔

۳۔ مذہبی مراسم اور اعیاد

عیدالاضحیٰ: یہ عید ترکی کی سب سے بڑی مذہبی اور سرکاری عید ہے لوگ اس دن قربانی کرتے ہیں اس عید پر ترکی میں دس، گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحجہ کو چار دن کی سرکاری تعطیل ہوتی ہے۔

عیدفطر: عیدفطر دوسری بڑی عید شمار ہوتی ہے اس عید کے موقع پر پہلی، دوسری اور تیسری شوال کو تین دن تک سرکاری تعطیل ہوتی ہے۔ اس عید کے موقع پر ترکی میں بچوں میں خصوصی طور پر ٹافیاں اور مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں جو شکر بایرامی (Seker bayrami) کے نام سے بھی مشہور ہے۔

قندیل راتیں: قندیل کے نام سے ان راتوں کے معروف ہونے کی علت یہ ہے کہ ان راتوں میں مسجد کے مناروں پر چراغ اور شمع کو روشن کیا جاتا ہے اور یہ راتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱)۔ شب عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو ''مولید کاندیلی'' کے نام سے معروف ہے یہ شب بارہ ربیع الاول کی شب ہے۔

۲)۔ رجب کے مہینے میں پہلی شب جمعہ: جو ''رغائیت کاندیلی'' کے نام سے مشہور ہے۔

۳)۔ شب معراج: یہ شب ۲۷/ رجب بعثت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شب ہے جو ''میراج کاندیلی'' کے نام سے مشہور ہے۔

۴)۔ شب ۱۵/ شعبان: جو ''برات کاندیلی شب '' کے نام سے معروف ہے۔

عاشورا کے دن استنبول جیسے بڑے شہروں میں عثمانی دور کی قدیم سنت کے مطابق ایک قسم کا آش ''بنام آش عاشورا'' پکایا جاتا ہے اس آش میں دس عدد کے مطابق مواد ڈالا جاتا ہے۔ علوی لوگ محرم کے پہلے عشرے کی طرح دوسرے عشرے میں بھی کچھ دن روزہ رکھتے ہیں۔ سیدالشہد احضرت امام حسین علیہ السلام کی عزاداری پہلے مخفی

طور پر منائی جاتی تھی لیکن آج کل بڑی عظمت کے ساتھ آشکارا طور پر منائی جاتی ہے اور اس میں شیعوں کے علاوہ بڑی تعداد میں اہلسنت اور علوی بھی شرکت کرتے ہیں۔

اقوام: جیسا کہ ترکی گزشتہ صدیوں میں مختلف نسلوں اور ثقافتوں پر مبنی گروہوں کا محل رہا ہے اس سرزمین پر متعدد قوموں اور نسلوں کو دیکھا جاسکتا ہے اس سرزمین پر زیادہ تر اثر و رسوخ اور حکومت مرکزی ایشیائی ترکوں کی رہی ہے عثمانیوں کے دور سے حملہ آور ترکوں اور مدیترانہ نسل کے باہمی اشتراک سے ایک نئی اور جدید نسل وجود میں آئی ہے جو اس ملک کی غالب نسل شمار ہوتی ہے۔

ترکی کے ذرائع ابلاغ میں نشر ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق اس ملک کی ۸۵ فیصد آبادی ترک اور ۱۵ فیصد اقلیتی آبادی کردوں ارمنیوں، عیسائیوں جارجیائی، یونانیوں اور عربوں [۱] پر مشتمل ہے۔ کرد ترکی کی سب سے بڑی اقلیت (۱۵ سے ۲۰ ملین افراد) شمار ہوتے ہیں جو زیادہ تر اس ملک کے جنوب مشرقی حصہ میں ساکن ہیں۔ ارمنی دریائے وان، جارجیائی دریائے اسود کے ساحل، یونانی استنبول اور اعراب ترکی عراق اور شام کی سرحد اور ترکی کے جنوب شرق میں آباد ہیں۔

۱۔ ترکی عرب تقریبا دو ملین ہیں۔